دلچسپ اسلامی اور تاریخی ناول



Checked 197[illegible]

بدرالنسأ کی مصیبت

ملنے کا پتہ

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب و پبلشرز

کشمیری بازار لاہور

۷۸۶

حیرت انگیز دلچسپ افسانہ

موسومہ بہ

ملک العزیز ورجینا عہ

حسن انجلینا عہ

Checked 1975

بدرالنساء کی مصیبت

مصنفہ

جناب مولینا محمد عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

منصور موہنا عہ

فردوس بریں ۱۲

ملنے کا پتہ

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

مولانا شررؔ کی دیگر تصانیف

ملک العزیز ورجنا } یہ ناول جس میں اسلامی شان و شوکت اور دینی جوش کے بے نظیر نمونے نظر آتے ہیں۔ بڑا دلچسپ اور پر از معلومات ہے قیمت ....عہ

حسن انجلینا } یہ وہ ناول ہے جس میں ترکوں اور روسیوں کی لڑائی کے سچے تاریخی واقعات درج ہیں۔ ترکوں کا اہل ایران سے اتفاق اور اہل اسلام کا جوش اسلام سے ترکی امداد کو آنا اور روسیوں کو متواتر ترکیں دیکر بہ عظیم الشان فتوحات حاصل کرکے اسلامی جوش اور ہمدردی دکھانا۔ آخر کار شیعہ اور سنیوں کا مذہبی فساد ہونا۔ عجیب غریب اور دلچسپ حالات ہیں۔ قیمت ۸عہ

منصور موہنا } اس ناول میں سلطان محمود غزنوی کے جو اسلام اور ہندو راجہ اجمیر کی بہادری کی سچی تصویریں نظر آتی ہیں۔ بڑا دلچسپ ہے قیمت ۸عہ

شہید وفا } نہایت ہی دلپذیر اور پر اثر قصہ اسپین کی تاریخ سے لے کر عجیب پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ یہی ایک کتاب ہے۔ کہ جس کے ذریعہ سے نظیر آسکتا ہے۔ کہ اہل عرب کے زوال کے وقت ہسپانیہ عظمی میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی قیمت صرف عہ

دلکش کامل } ان طالب علموں اور کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے حالات کا نقشہ ایسے دلکش پیرایہ میں کھینچا گیا ہے۔ جو اپنے والدین کی آنکھوں سے دور کالجوں اور سکولوں میں منچلا پن کر جاتے ہیں۔ کہ بایدوشاید بڑا دلچسپ ناول ہے قیمت ۸عہ

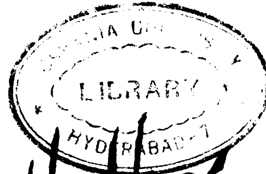
دلچسپ کامل } ہندوستان کے ایک معزز خاندان کے حالات کا آئینہ انگریزی بلیغ انشا پردازی کا نمونہ حرفوں کے ذریعہ سے تصویر دکھلانے کا آلہ اردو کو ایک باعزت زبان بنا دینے کی کل دلوں پر اثر ڈالنے کی حکمت عملی قیمت (۸عہ)

ملنے کا پتہ:

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

P. G.



پہلا باب

گڈے گڑیا کی سی شادی

کبرا بیگم جیسی طبیعت کی ضدن تھیں۔ ویسی ہی چڑچڑی بھی واقع ہوئی تھیں قاعدہ تھا۔ کہ جہاں کسی بات کو ایک دفعہ کہا۔ بس رات نگ جاتی۔ اور ہزار سمجھاؤ۔ ایک نہ مانتیں گھر سے خوشحال تھیں۔ نوکر چاکر روپیہ پیسہ سبھی کو دیا تھا۔ مگر مزاج کے ہاتھوں سب لوگ حیران تھے۔ خدمتگار تو دروازے کے باہر رہتے۔ اور خوش تھے۔ اس لئے کہ ان کا سلیقہ میاں سے تھا۔ جو اتنے ہی خوش مزاج اور رحمدل تھے۔ جتنی کہ بی بی بدمزاج اور سخت واقع ہوئی تھیں۔ شامت تھی تو ماماؤں کی جن کو روز مرّت نئی مصیبت رہتی۔ کبھی اطمینان سے بیٹھنا نہ نصیب ہوتا۔ مگر گھر خوشحال تھا اور مہنگا سماں اس لئے بیچاریوں سے نوکری چھوڑتے کبھی نہ بن پڑتی۔

اسی بدمزاجی کے خوف سے کبرا بیگم کے میاں شوکت حسین بھی ذرا سوچ سمجھ کر گھر میں قدم رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ دور رہتے۔ آٹھ برس کے بچے عسکری کا یہ حال کہ اگرچہ اکلوتا اور ماں کا لاڈلا بیٹا تھا۔ مگر ماں کے کتنے جھکنے کے ڈر سے ہمیشہ باہر رہتا۔ اور گھر میں آتا بھی

تو ڈرتا ڈرتا اور سہما ہوا عسکری بہت پیارا بچہ تھا۔ گورا چٹا ناک سک سے درست اور سو پچاس میں ایک۔ اور پڑھنے میں جی لگانے لگا تھا۔

بہرحال کبرے بیگم اکثر یکہ و تنہا ہی رہتی تھیں۔ ان دنوں برسات کا زمانہ ہے۔ پانی کا ایک دونگڑا ابرس کے نکل گیا ہے۔ ابر کے پھٹے پھٹے ٹکڑے ہوا فراٹوں کے ساتھ مغرب کی بڑی تیزی سے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ آفتاب کھلتا ہے۔ اور چھپ جاتا ہے۔ دھوپ نکلتی ہے۔ اور غائب ہو جاتی ہے۔ کبرے بیگم اپنے بلند در صاف دالان میں ایک چھوٹی پلنگڑی پر بیٹھی دلیاں کتر رہی ہیں۔ اور کچھ آپ ہی بدبدا نی بھی جاتی ہیں۔ اتنے میں شوکت حسین اندر آئے۔ اور بغیر اس کے کہ بیوی کی طرف نظر بھی اٹھائیں۔ سیدھے باورچیخانہ میں چلے ہیں چلے گئے۔ وہاں جا کے ماما سے کچھ کہا۔ لے تو اب وہ کون سی ساعت آئے گی۔ جب خط لکھا جائے گا۔

شوکت حسین رک کے تمہارے بھائی کو؟ کب کا لکھ کے بھیج چکا۔ آج کون دن ہے

عباسی ماما (باورچی خانے سے)" اے میاں آج اتوار ہے۔

شوکت حسین " اتوار؟ اور اس ہفتہ کو میں نے لکھا تھا۔ یہ سمجھو کہ خط گئے تو دن ہو چکے آج کل میں جواب آتا ہو گا۔

کبرے بیگم۔ اے ہو بھی ایسے ہی تو ہو۔ کہ میرے کہنے سے لکھ کے بھیجدیا ہو گا"

شوکت حسین (مسکرا کے)" سچ کہتا ہوں۔ میں نے جبھی بھیجدیا"

کبرے بیگم " (بگڑ کے)" بھئی میری بات پر ہنسا نہ کرو۔ وہ تو نگوڑی جو بات کہتی ہوں الٹی ہو جاتی ہے"

شوکت حسین " اب تمہیں یقین ہی نہ آئے۔ تو کیا کروں؟"

کبرے بیگم " وہ تو ہر طرح میں ہی بری ہوں؟"

شوکت حسین۔ اب یہاں کوئی برے بھلے کا تو ذکر ہی نہیں۔ لیکن ہاں اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ تم نہ الٹی سمجھتی ہو۔ نہ سیدھی۔ کوئی تمہیں سمجھائے تو کیونکر؟"

کبرے بیگم " (غل مچا کر)" ہاں وہ تو میں بیوقوف ہی ہوں۔ کسی کی بات تک نہیں سمجھ سکتی تو کو پھر مجھ سے کیوں بولتے ہو؟ بھلی ہوں یا بری جیسی ہوں اکیلا پڑا رہنے دو۔ ارے یہ غضب خدا نہیں دیکھا۔ کہ سر چڑھ چڑھ کے آئیں۔ اور بے وقوف بنائیں۔

بی بی کی یہ بدمزاجی دیکھ کے شوکت حسین نے ایک لاپرواہی سے "ہونہہ" کہا اور باہر چلے گئے کبرای بیگم اس بے پرواہی پر اور برہم ہوئیں۔ میاں پر تو کچھ زور نہ چلا غریب ماما پر برس پڑیں۔ چلا کے کہا "اے عباسی۔ یہ کیا تھا؟ یہ تیرے پاس کیوں آئے تھے اور تجھ سے ہنس کے کیا کہا۔

عباسی جوان عورت تھی۔ چہرے پر جوانی کا نمک ابھی برقرار تھا۔ وہ تو نوکری نہ کرتی مگر مہنگا سماں تھا۔ میاں کی تنخواہ کے چھ روپوں میں کسی طرح پوری نہ پڑتی۔ ناچار گھر چھوڑ کے نوکری کو نکلنا پڑا۔ لیکن اپنے میاں کی صورت کی عاشق تھی۔ وہ بھی کچھ ایسا ریجھا ہوا تھا کہ روز شام کو آکے دو باتیں ضرور کر جاتا کبرای بیگم نے جو ایسا تہمت بھرا لفظ منہ سے نکالا تو عباسی کے دل پر تیر سا لگا۔ مگر نوکری کا واسطہ تھا۔ خاموش ہو رہی۔ اور کہا۔ بیوی مجھ سے قسم لے لیجئے جو میاں نے میری طرف نگاہ بھر کے دیکھا بھی ہو۔ باہر کوئی غریب محتاج آیا۔ بس اتنا کہنے کو آئے تھے۔ کہ اُسے کھانا دلوا دیا جائے۔

کبرای بیگم - ہاں ٹال دے۔ اے میں بھی سمجھتی ہوں۔

عباسی - بیوی جناب امیر کی قسم جو میں ٹالتی ہوں"

کبرای بیگم - (چلا کے اور غصے سے) "ایک تو قطاسہ باتیں بناتی ہے۔ پھر اُس پر جھوٹی قسمیں کھاتی ہے۔

یہ سُنکر عباسی نے زار۔ قطار رونا شروع کیا۔ اور کہنے لگی "بیوی آپکا نمک کھاتی ہوں۔ یہ تو مجال نہیں۔ کہ حضور کی بات کو ٹُک سکوں۔ مگر اتنا ضرور کہونگی۔ کہ آج تک میری عزت و آبرو پر کسی نے حرف نہیں رکھا۔ آپ کے تصدق میں پیٹ بھر کے کھا لیتی ہوں۔ یہ بھی نہ سہی مگر مجھے آبرو کر کے نہ نکالیئے"

کبرای بیگم یہ اس سے کہ جس نے تجھے نوکر رکھا ہو مجھ سے واسطہ؟ انہوں نے اسی لئے تو لا کے گھر میں بٹھایا ہے۔ کہ مجھے ہنس ہنس کے کڑھائیں؟ اے وہ کڑھنا تو میری قسمت ہی میں ہے"

عباسی - (حیرت سے) لا حضور یہ آپ کیسی باتیں کرتی ہیں! میرے میاں کے کانوں تک ذرا بھنک پڑ جائے۔ تو وہ میرا سر ہی منڈوا ڈالیں۔ خدا کے لئے بیوی ذری زبان روکے چاہیئے۔

کبرای بیگم "اے تم خیر سے اتنی ہوئیں۔ کہ مجھ سے زبان روکنے کی فرمائش ہوتی ہے۔ کیوں نہیں اے ابھی کیا ہے؟ جب تک کوا پکھنی نہ بنالیں گے۔ چین تھوڑی ہی آئے گا۔

اتنے میں شوکت حسین دو خط ہاتھوں میں لئے ہوئے اندر آئے اور اُنکو بیوی کے سامنے ڈال کے بولے "تو تمہارے بھائی کے پاس سے جواب بھی آگیا" کبرے بیگم نے دونوں خط اُٹھا کے دُور پھینک دیئے۔ اور بولیں "جب گھر میں آتے ہیں۔ نگوڑا ایک نیا نخرہ لے کے آتے ہیں"

میاں نے حضرت سے بیوی کی صورت دیکھی۔ اور کچھ کہنے کو تھے۔ کہ عباسی آکے روتی ہوئی تہ ہوں گر پڑی۔ اور بولی "اس رسوائی سے تو اچھا ہے۔ کہ مجھے آزاد کر دیجئے میاں میں غریب ہوں۔ محتاج ہوں سب طرح سے ذلیل ہوں۔ مگر آج تک کسی نظر میں بے آبرو نہیں ہوئی"

شوکت حسین (اور زیادہ متحیر ہو کے) تو تمہیں کون بے آبرو کہتا ہے؟"

عباسی۔ اب بھلا میں کسی کا نام لوں مجال پڑی ہے؟ مگر میاں آپ مجھ سے بات نہ کیا کیجئے آپ ہر طرح اچھے رہیں گے۔ اور میں گھر بار سے گئی گذری ہو گی"

کبرای بیگم "اے تو نام کیوں نہیں لیتی! کچھ میں ڈرتی ہوں! ہاں ہاں میں کہتی ہوں۔ پھر تم جوان ناناؤں سے ہنسو گے۔ دلگیا ہونگی۔ ور میں نہ کہوں گی؟"

شوکت حسین کو یہ باتیں سُن کے پہلے تو غصہ آیا۔ مگر ساتھ ہی بیرحمی کی بدمزاجی کا خیال کر کے ہنس پڑے اور مُنہ پر رومال رکھ لیا۔

کبرای بیگم۔ ہاں ہاں کرمعاؤ ہنس ہنس کے جلاؤ۔ اس کے سوا اور تم سے اُمید ہی کیا ہے؟"

شوکت حسین "خیر اور باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ یہ تم نے اپنے بھائی کا خط کیوں پھینک دیا"

کبرای بیگم۔ میں نے تمہاری باتوں کا نگوڑ ماری کو اعتبار ہے۔ یہ بھی ایک فقرہ ہے"

شوکت حسین یہ فقرہ تو جب ہوتا۔ کہ جب میں فقط زبان سے کہتا۔ تو خود اُن کا خط موجود ہے۔

کبرای بیگم "اب یہ کیسے خبر کہ کس کا ہے؟ کچھ میں پڑھتی تھوڑی ہوں۔ کہ پہچان لوں تمہارے پاس روز ہی خط آیا کرتے ہیں۔ عباسی کی سی کوئی اور بھی ہو نگی۔ شاید انہوں نے لکھ بھیجا ہو۔

یہ جملہ سنتے ہی عباسی تو اپنا سر پیٹنے لگی۔ اور شوکت حسین نے کہا بیگم! یہ اپنے سائے سے بھڑکنا اور بات بات پر بدگمان ہونا اچھا نہیں۔ خیر سنو تمہارے بھائی کا خط آیا ہے۔ وہ تم سے ملنے کو یہاں آج ہی کل میں آیا چاہتے۔ اور خط لکھنے کے تیسرے دن انہوں نے تار دیا ہے۔ جس معلوم ہوا کہ حیدر آباد سے چل چکے۔ اور کل دوپہر کو یہاں لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچیں گے۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ دیا۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہو یقین مانو۔ یا نہ مانو" اس کے بعد بیوی کی نظر بچا کے عباسی سے اشارہ کیا۔ تم خاموش رہو۔ میں سمجھا دوں گا"

کبرای بیگم "مجھے تو جب یقین آئے۔ کہ وہ اصل خیر سے یہاں آکے پہنچ جائیں۔

شوکت حسین "کل یہ بھی ہو جائے گا"

کبرای بیگم۔ مگر سنو میں ابھی سے کہے رکھتی ہوں۔ کہ اپنے بھائی کے ساتھ حیدر آباد جاؤں گی"

شوکت حسین" ہاں ہاں جا کے کیا بناؤ گی۔

کبرای بیگم "جو جی میں آئے گا۔ یہ یہاں کی روز روز کی کوفت تو مجھ سے نہ اٹھائی جائے گی"

شوکت حسین "تمہیں اختیار ہے۔ چاہو یہاں رہو چاہو وہاں رہو"

کبرای بیگم۔ اے ہاں دو بھر تو ہی رہوں۔ اور یہاں رہو گی۔ تو عباسی سے یہ دوگیاں کیونکر ہوں گی

شوکت حسین نے یہ سن کے کہا کہ واز اللہ! کوئی انتہا ہے۔ اور بیوی بکتا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے دن کبرای بیگم کے بھائی اکبر علی آ گئے۔ جن سے مل کے بہن بہت خوش ہوئیں۔ اور ایک دو دن کے لئے گھر میں ذرا ہنسی خوشی کی باتیں ہیں۔ اکبر علی لکھنؤ کے ایک شریف شخص تھے۔ گیارہ برس ہوئے اُن کے والد نے محتاجی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دے دی تھی۔ اور ان دونوں بہن بھائی اور عورت بھی افلاس کی بات ہیں چھوڑ گئے

تھے۔ بہن کا خوش نصیبی سے شوکت حسین کیساتھ نکاح ہو گیا۔ جن سے دُور کی قرابت تھی۔ اور خوشحال تھے۔ مگر بھائی جن کی شادی باپ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی کچھ دنوں وطن میں تلاش معاش کرتے رہے۔ اور جب کچھ کام نہ چلا تو بیوی کو ساتھ لے کے غریب الوطنی اختیار کی اور حیدر آباد دکن کو روانہ ہوئے۔ وہاں بھی کچھ دنوں نوکری ڈھونڈی مگر بے سُود آخر مجبور ہو کے قانونی پیشہ اختیار کیا۔ اور اول درجے کی وکالت میں پاس ہو گئے۔ اس پیشے میں کچھ کچھ کام چل نکلا۔ اور ایسی حیثیت ہو گئی۔ کہ ایک معمولی شریف آدمی کی طرح زندگی بسر کر لیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ کبرے بیگم کو نکاح کے دن سے کبھی میکے کا مزہ نصیب نہ ہوا تھا۔ جس کا اکثر صدمہ رہتا۔ اور جب سے سُنا کہ بھائی اب اچھی طرح ہیں۔ یکایک میکے والی ہونے کا دعوے پیدا ہو گیا۔ اور بات بات پر میاں کو بھائی کے پاس چلے جانے کی دھمکی دیا کرتی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا۔ کہ بھائی کی مصیبت کٹ جانے کا حال سُن کے بہن کا سر پھر گیا ہے۔ خیر جا ہے جو کہئے۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ بہن کی محبت یا جنون نے بھائی کو لکھنؤ میں کھینچ ہی لایا ؟"

اکبر علی کو زیادہ ٹھہرنے کی فرصت نہ تھی۔ اول تو بیوی کو وہیں حیدر آباد میں چھوڑ آئے تھے۔ دوسرے ان دونوں مقدمات کا زیادہ ہجوم تھا زبردستی موکلوں کو دم دلاسا دے کے صرف پندرہ روز کا زمانہ اس سفر کیلئے نکال لیا تھا۔ اس میں بھی چھ دن آنے جانے کے کل نو دن ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ پہلے تو بہن نے زیادہ ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ مگر جب اکبر علی نے کسی طرح نہ مانا۔ تو خود ساتھ جانیوالے اور بھاوج سے مل آنے پر آمادہ ہو گئیں۔ شوکت حسین کے نزدیک یہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ مگر بیوی ایسے مزاج و دماغ کی پائی تھی۔ کہ زیادہ انکار کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ آخر جب اکبر علی نے بہن کے ساتھ لیجانے اور چھ مہینے کے بعد خود پہنچا جانے کا وعدہ کیا۔ تو طوعاً و کرہاً راضی ہو گئے۔ بیٹے کے حیدر آباد بھیجنے کو وہ کسی طرح منظور نہ کرتے تھے۔ مگر بیوی آخر اپنی ضد میں کامیاب ہوئیں۔ اور اگرچہ عسکری خود بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر اُس غریب کی سنتا تھا۔

آخر آنے کو نویں دن اکبر علی اپنے بہنوئی سے رخصت ہو کے ریل میں بیٹھے۔ اور ٹرین روانہ ہوئی۔ تیسرے دن شام کو کبرے بیگم حیدر آباد کے اسٹیشن پر ریل سے

اُتر کے فینس میں بیٹھیں اور کہار شور کر کے اور ایک ناگوار نغمہ گاتے ہوئے اکبر علی خان وکیل درجہ اول کے دروازے پر آ پونچے۔ کبرا ے بیگم نے اُترتے ہی بھاوج سے مل کے دو چار آنسو بہائے اور بیٹھ کے باتیں کرنے لگے اکبر علی کو بیوی بلقیس بیگم نے کہا "بہن تم اب لیٹ کے سو رہو۔ تین دن کی تھکی ہو سارا بدن پھوڑا ہو گیا ہو گا۔

کبرا ی بیگم۔ خیر اللہ تو کسی بات کی شکایت نہیں۔ مگر ریل کی آواز تو جیسے کانوں میں بھر سی ہو گئی۔ اور بہن رہے سہے کان ان موئے کہاروں نے اُڑا دیے۔ موئے نڈسی کاٹوں نے "ہو ہو ہو" کا وہ شور مچایا ہے کہ پناہ"

بلقیس بیگم۔ "ہاں بہن یہاں کے کہاروں کا یہی قاعدہ ہے"

کبرا ی بیگم۔ "اسے دور کرو۔ اس نگوڑے قاعدے کو جس سے دماغ اُلٹ جائے۔

انہیں چند باتوں کے بعد کھانا کھا کے کبرا ے بیگم سو رہی۔ اور اُنکے بعد سارے گھر پر نیند سوار تھی۔ اس لئے کہ اکبر علی اور عسکری بھی تھکے ماندے تھے"

کبرا ے بیگم کی وہ ضد اور اُن کا وہ چڑچڑا پن یہاں آ کے جیسے بالکل جاتا رہا۔ دن بھر بھاوج سے بیٹھی ہنسا بولا کرتیں اور اس بدمزاجی کا جیسے نام بھی نہیں رہا تھا اور کوئی تعجب نہیں۔ کہ وہ ساری بدمزاجی صرف اسی سے ہو ئی کہ لکھنو میں سوا۔ سسرال والوں کے کوئی اپنا نہ ملتا تھا۔ جس کے صدمے نے غالباً دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ بہر حال اب وہ اچھی ہیں۔ اور خوش مزاج۔

ایک دن تیسرے پہر کو کبرا ے بیگم کے آگے پاندان کھلا رکھا تھا۔ اور ڈلیاں کتر رہی تھیں۔ بلقیس بیگم پاس بیٹھی اپنی بیٹی بدر النساء کی ٹوپی کی گوٹ پر چٹکی کا لہر بنا رہی تھیں۔ اور بدر النساء جو بدرو بدرو کہلاتی تھی۔ اور ابھی پانچ برس کی بچی تھی۔ سامنے انگنائی میں عسکری کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ اتنے میں کبرا ے بیگم نے پان کی گلوری منہ میں رکھ کے کہا۔ جب سے یہاں آئی نگوڑے پان کا مزا جاتا رہا۔ دن بھر گھاس سی چباتی ہوں۔ اور کسی طرح منہ کو نہیں لگتا۔

بلقیس بیگم۔ اُسی طرح ٹوپی پر نظر جمائے ہوئے" ہاں یہاں کے پان سخت ہوتے ہیں۔ تمہارے وہاں کے کپوری پانوں کا سا مزہ ہے۔

کبرا ے بیگم۔ اے نہیں میں تو کہتی ہوں۔ کہ کپوری بھی ان سے اچھے

ہیں"

بلقیس بیگم - جن لوگوں کو ان باتوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ انہیں وہاں کے پانوں میں مزا نہیں آتا۔"

کبراٰی بیگم - انگنائی کی طرف دیکھ کے "اے بیٹا بدرو یہاں اندر آکے کھیلو۔ عسکری تم یہاں آؤ۔ دھوپ میں ہلکان ہونے سے حاصل (بلقیس بیگم سے) "بہن بدرو کو باہر نہ کھیلنے دیا کرو۔ پھول سی لڑکی دھوپ میں جھلس جھلس کے کالی ہوئی جاتی ہے۔

بلقیس بیگم" (کترنے کے لئے قینچی ہاتھ میں لیکے) "یہ ہیں تو رات دن پیچھے پڑی رہتی ہوں۔ مگر وہ سنتی کب ہے۔ اے بیٹا بدرو (چمکار کے) اندر چلی آؤ دیکھو تمہاری پھوپھی جان کہتی ہیں۔ اور تم نہیں سنتیں!"

بدرو" (چلا کے) "اے امی یہاں آئی ذری اپنی گڑیا کے کپڑے دھو تو لوں"

بلقیس بیگم (کبراٰی بیگم سے) "بہن دن بھر پانی میں بھیگتی ہے۔ اور ہزار کہو ایک نہیں سن سکتی۔ (چلا کے) اے تو کل صبح کو دھو لینا۔ اس وقت چلی آؤ۔"

بدرو" واہ اُس کے بچے نے پاخانہ پھر دیا ہے۔ پڑے تڑے نہ دھوؤں!"

کبراٰی بیگم - (ہنس کے) اے تو وہ نئی خود نہیں دھوتی؟"

بدرو" اُئے چھٹی نہیں"

کبراٰی بیگم - اے ہیں سر مونڈ والیوں کی۔ مونڈی کاٹی کا۔ میری بچی سے مت نا لیتی ہے۔ اور آپ کچھ نہیں کرتی"

ان دونوں باتوں پر بلقیس بیگم اور کبراٰی بیگم دونوں خوب ہنسیں۔ اور کبراٰی بیگم نے کہا۔ "بہن تم اسے بدرو کیوں کہتی ہو۔ بندریا کہا کرو۔ پوری بندریا ہے! ہاں بہن یہ بتاؤ۔ کہیں سے بدرو کے لئے بات چیت بھی ہوئی یا نہیں!"

بلقیس" اے ابھی تو نہیں۔ مگر ان کے ابا کا ارادہ ہے۔ کہ کہیں پہیں کر دیں۔

کبراٰی بیگم "یہ ہیں! اے توبہ کرو بہن غیروں میں شادی بیاہ کرکے کہیں کبھی پوری اتری ہے۔

بلقیس بیگم " ہاں میں تو ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ مگر تمہارے بھائی گرویدہ ہو رہے ہیں "

کبرای بیگم۔ نہیں بہن یہ نہیں ہو سکتا۔ میں خود بھائی سے کہوں گی "

بلقیس بیگم۔ شاید تمہارا کہنا مان لیں۔ مگر میری تو وہ کبھی سنتے نہیں "

بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ نند بھاوج انہیں باتوں میں تھیں کہ خود اکبر علی آ گئے۔ اور بیوی سے چائے مانگتے ہوئے گھر میں گھسے۔

بلقیس بیگم " ادنی عضب مائی " نند سے " بہن تمہاری باتوں میں مجھے ان بیاہے کا خیال ہی نہ رہا " اور یہ کہہ کے باورچی خانہ کی طرف لپکیں۔ کہ جھٹ پٹ پانی تیار کریں۔ اکبر علی باہر سے آ کے بہن کے پاس بیٹھ گئے۔ اور مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔ کہو یہاں گھبراتی تو نہیں ہو "

کبرای بیگم۔ نہیں گھبرانے کی کون بات ہے۔ ذرا ٹھہر کے اور یکایک متوجہ ہو کے۔ اے ہاں بھائی تم نے بدرو کی کہیں نسبت نہیں ٹھہرائی! "

اکبر علی " ابھی جلدی کیا ہے۔ جب پندرہ سولہ برس کی ہوئی۔ دیکھا جائیگا۔

کبرای بیگم " آخر کہیں بات چیت تو ہونی چاہیئے۔

اکبر علی " ہاں بہن میرا تو یہ ارادہ ہے۔ کہ کہیں یہیں مناسب دیکھ کے کر دوں

کبرای بیگم " اے اللہ اللہ کر بھائی! کیا تمہارے گھر میں کوئی لڑکا نہیں۔ جو باہر ڈھونڈھنے نکلو گے؟ "

اکبر علی۔ اب میں تو یہاں رہتا ہوں۔ وہاں کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف نہیں رہا۔ وہاں تو مجھے بڑی دشواریاں نظر آتی ہیں۔

کبرای بیگم " اے تو آخر ہم کس واسطے ہیں۔ اور دور جانے کی کیا ضرورت ہے عسکری میں کیا برائی ہے

اکبر علی " اول تو مجھے اسی کا یقین نہیں۔ کہ تمہارے میاں منظور کریں گے

کبرای بیگم۔ انہیں اس میں کیا دخل کرنے یا نہ کرنے والی جو کچھ ہوں میں تو کہتی ہوں "

اکبر علی "ٹالنے کے طریقے سے، تاہم اُن سے دریافت کرنا ضرور ہے" اتنا کہہ کر اکبر علی اُٹھ کے چوکی پر چلے گئے۔ انکی بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے ہوئے کبرای بیگم کے پاس آ بیٹھیں۔ اور چپکے چپکے کہا" میں نہ کہتی تھی۔ کہ نہ کریں گے۔ وہ تو میں پہلے ہی سے سمجھی ہوئی تھی۔ کہ ٹال دیں گے۔

کبرای بیگم۔ اے تم دیکھو۔ تو بھلے کو میں یہاں آگئی۔ اب پورا اطمینان کئے بغیر تھوڑی ہی جاتی ہوں"

تھوڑی دیر کے بعد اکبر علی نے پیخانے سے چائے پی۔ اور باہر جانے کو تھے کہ بہن نے روک کے کہا" تو بھائی پہلے مجھے صاف جواب دیدو پھر جانا۔

اکبر علی" جواب کس بات کا"

کبرای بیگم" میری شادی کی بات بھابی چاہے۔ اس میں کچھ ہو جائے۔ تم سے بدرو کو لوں گی۔ اس میں تم انکار نہیں کر سکتے۔

اکبر علی۔ ارے تو جلدی کیا پڑی ہے؟ ابھی تو دونوں بچے ہیں۔

کبرای بیگم۔ نہیں بھائی مجھے اندیشہ ہے۔ کہ کہیں لڑکی کو غیروں میں نہ دیدو۔ بس اتنا ہی چاہتی ہوں۔ کہ دونوں کا نکاح ہو جائے۔ پھر رخصت جب چاہے کر دینا۔

اکبر علی" (ایک قہقہہ مار کے") نکاح اور ابھی سے؟ یہ تو ہندوں کی سی شادی ہو گئی۔

کبرای بیگم" جو ہو۔ اب میں بغیر اس کے لکھنؤ نہ جاؤں گی۔

اکبر علی" میں تو شاید تمہارے کہنے سے باہر نہ ہوں۔ مگر اس بارہ میں بھائی شوکت حسین سے بھی تو پوچھ لینا چاہیئے۔ بی بی کی طرف دیکھ کے کیوں ہے نا؟"

بلقیس بیگم" بے شک ان کی رائے سب پر مقدم ہے۔

کبرای بیگم۔ تو آج ہی اُن کو ایک خط لکھ بھیجو"

اکبر علی۔ (ہنس کے) کیسی باتیں کر رہی ہو؟ لڑکی کا واسطہ ہے۔ اور میں ہی خط لکھوں

کبرای بیگم۔ تو اب میں لکھی پڑھی نہیں۔ جب لکھو گے تمہیں لکھو گی۔ اپنی طرف

نہیں میری طرف سے سہی"
اکبر علی۔ (کچھ سوچ کے) خیر تمہاری طرف سے خط بھیجتا ہوں۔ تمہیں ابھی نکاح کھیل سا معلوم ہوتا ہے۔
کبرای بیگم۔ پر چاہو اسے کھیل سمجھو۔ یا کچھ اور مگر میں ہے دی ہوں تمہیں ابھی نکاح کرنا پڑے گا۔
اکبر علی۔ اچھا پہلے بھائی شوکت حسین کا خط تو آ لینے دو"

یہ کہکر اکبر علی گھر سے نکل کے باہر آئے۔ اور شام کو جب تنہائی میں موقع ملا۔ تو بہنوئی کے نام خط لکھ کے پہلے بہن کو سنایا۔ پھر بند کر کے ڈاک میں دلوا دیا۔ اور اٹھوارے کے اندر جواب بھی آ گیا۔ شوکت حسین نے انکار تو نہیں کیا تھا۔ مگر ٹالا تھا۔ کہ ابھی بالکل قبل از وقت ہے۔ مگر کبرای بیگم کی ضد۔ اور پھر میاں کے مقابلہ میں تابڑ توڑ خط جانا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ بیچارے نے مجبور ہو کے لکھ دیا "تمہیں اختیار ہے" پھر کیا تھا گھی کے چراغ جل گئے۔ گڈے گڑیا کی شادی تو کیا نکاح ہو گیا۔ اور قاضی کو بلوا کے وہ بول پڑھوا دیئے گئے۔ الغرض لکھنؤ چھوڑ کے پورے ایک مہینے بعد کبرای بیگم عسکری کو لے کر اپنے گھر آئیں اور ساس بن گئے۔ اب کیا تھا۔ چند ہی روز وہی بدمزاجی تھی۔ اور وہی چڑچڑا پن حقیقت میں سسرال کی آب و ہوا اُن کے مزاج کے بہت ناموافق ہے۔ اور خدا ہی ہے۔ جو بھائی کا گھر بھی آیندہ ایسا صحت بخش رہے۔ اس لئے کہ وہاں سے سمدھیانہ ہو گیا۔ جس کے معنے ہندوستان کی سوسائٹی میں گویٹّی ہو جانے کے ہیں۔

دوسرا باب

رخصتی

اس واقعے کو دس سال گذر گئے۔ پورے دس سال اور بدرالنسا ابھی تک اپنے گھر ہی میں ہے۔ اس مدت میں نہ کبھی سمدھی سمدھن کو آپس میں ملنے کا

اتفاق ہوا۔ اور نہ ہونہار لڑکے نے دلہن کی صورت دیکھی۔ خصوصاً۔ شوکت حسین تو جانتے ہی نہیں۔ کہ بہو کیسی ہے گوری ہے یا کالی خوبصورت ہے یا بدصورت عسکری کی عمر ماشاءاللہ سے اٹھارہ سال کی ہے۔ اور دلہن کو اب کے رجب سے پندھواں برس شروع ہوگا۔ لڑکے نے اچھی ترقی کی ہے۔ انٹرنس پاس کر چکا۔ اور ایف۔ اے کے فرسٹ ایر (پہلے سال) میں ہے۔ لڑکی کو بھی اکبر علی نے حیدرآباد کے مدرسہ نسواں داخل کر دیا تھا۔ جس میں چار یا پانچ سال حاضری کر کے پڑھنا لکھنا تو کیا آیا مگر ہاں دو ایک انگریزی نظمیں یاد ہوگئیں۔ ان کے تال پر ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے لگی۔ جرابیں اور گلوبند بنا آگیا۔ اور شاید اردو میں کچھ حرف شناس ہوگئی۔

سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ ہے۔ کہ کبرے بیگم مزاج میں تھوڑا بہت اعتدال پیدا ہوگیا۔ گھر میں رہتے رہتے پرانی ہوگئیں۔ کئی اونچے بھی گود میں پل کے بیوتں بیوتں گھنیٹوں گھنیٹوں چلے۔ اور اب انگنائی میں دوڑے دوڑے پھرتے ہیں ماما ئیں بھی بہت سی بدلیں۔ اور آخر کار ایک آدھ ایسی مزاج دار مل گئی۔ جو کبھی ایسے پہلو پر آتی ہی نہیں کہ بی بی خفا ہوں۔ اتنے دنوں کے تجربہ میں میاں کے اتقا اور نیکباری کا بھی اتنا امتحان ہوگیا۔ کہ اب وہ پہلی سی بات بات پر بدگمانی نہیں ہے۔ بہر حال اگرچہ اب بھی بدمزاج ہیں۔ مگر اتنی ہیں۔ کہ کبھی کبھی میاں سے دو منہ ہنس بول بھی لیتی ہیں۔

مگر یکایک بہو کے بلانے کا خیال آیا۔ اور پھر وہی چڑچڑاپن تھا۔ اور وہی ضد میاں کا ناک میں دم کر دیا۔ شوکت حسین کی رائے کو چونکہ اس نکاح میں بہت کم دخل تھا۔ اس لئے وہ اکثر لوگ الگ رہنے کی کوشش کرتے۔ مگر بی بی کو ایسی رٹ لگ گئی تھی کہ میاں کو گھر میں قدم رکھنا دشوار ہوگیا۔ بس ہر وقت بکتے جھکتے اور روتے چلاتے گذرتی تھی۔ میاں کے پاؤں کی سُنی۔ اور کہنا شروع کر دیا۔ کہ "تم تو بے فکر بنے بیٹھے ہو۔ اور میری جان پر بنی ہوئی ہے جس طرح ہو سکے تجھے ابھی خط لکھدو۔ نہیں جب تک نہ لکھدوگے باہر نہ جانے دوں گی" اس عام فرمائش کو اکثر تو وہ ٹال جاتے مگر کبھی ایسے شکنجے میں بھی پھنس جاتے۔ کہ لکھ ہی دینا پڑتا۔"

الغرض کوئی ہفتہ نہ گذرتا جس میں دس بارہ خط نہ لکھ کے روانہ کرتے پڑتے ہوں اس نہیں نہیں پر بھی اتنے خط لکھے گئے۔ کہ دو مہینے میں ڈیڑھ سو سے زیادہ خط

اکبر علی کے پاس پہنچے۔ اور ہر ایک میں یہی کہتا۔ کہ "بیٹی کو کب بھیجو گے؟ اکبر علی کو پہلے تو انکار ہی رہا۔ مگر اب لڑکی جوان ہو چکی تھی۔ گھر میں بٹھانا بھی خلاف مصلحت نظر آیا۔ ادھر ان ڈیڑھ سو خطوں نے توبہ بلوا دی تھی۔ طوعاً و کرہاً جس بنا راضی ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ ایک خوشی کی گھڑی میں ڈاکیئے نے آ کے شوکت حسین کو خط دیا۔ اور اُنھوں نے لیجا کے بی بی کو سنایا مضمون یہ تھا۔ کہ بیٹی کے بھیجنے پر تو راضی ہیں۔ مگر خود ان کے آنے کی چھٹی نہیں۔ کوئی لکھنؤ سے آ کے لے جائے کبرے بیگم کا ارادہ ہوا کہ خود حیدرآباد جا کے بہو کو دھوم دھام سے رخصت کرائیں۔ مگر میاں نے مطلق حامی نہ بھری اور کہا " اول تو میرے پاس ان دنوں روپیہ۔ اگر قرض و آم کے بندوبست بھی ہوا۔ تو جو کچھ کروں گا۔ لکھنؤ میں خاص اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سامنے کرونگا۔ وہاں حیدرآباد میں روپیہ خرچ کرنے سے مجھے کیا مطلب؟"

یہ ایک ایسی بات تھی۔ کہ کبرای بیگم کے دل پر بھی جم گئی۔ عورتوں کو معمولاً ایسی باتوں کا زیادہ خیال ہوا کرتا ہے۔ ذرا سوچ کے بولیں " تو اچھا۔ پھر لڑکی کو لینے کون جائے گا؟"

شوکت حسین " اب میں کیسے بتاؤں؟"

کبرای بیگم " تمہارے سوا کون ہے؟"

شوکت حسین۔ مجھے تو آج کل چھٹی نہیں "

کبرای بیگم۔ اچھا تو عسکری کو بھیج دو۔ وہ خود جا کے اپنی دلہن کو لے آئیگا۔

شوکت حسین۔ اُس کے پڑھنے کا ہرج ہو گا۔ سال کا آخری زمانہ ہے۔ امتحان سر پہ آ گیا۔ فیل ہو گیا۔ تو برس بھر کی محنت اکارت جائے گی "

کبرای بیگم۔ (ٹھنک کے) اب تم جاؤ گے نہیں۔ عسکری کے پڑھنے کا ہرج ہو گا۔ پھر آخر ہو گا کیا؟ اب اکیلی میں جانے سے رہی "

شوکت حسین " میرے خیال میں تو اپنے بھائی کو لکھ بھیجو۔ کہ وہی آ کے پہنچا جائیں "

کبرای بیگم۔ ایک تو وہ لکھ چکے کہ نہیں آ سکتے۔ دوسرے سو بات کی ایک بات یہ ہے۔ کہ لڑکی تمہاری ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنا فرض پورا کر چکے۔ اب انھیں کیا غرض پڑی ہے۔ جو اپنا روپیہ لگا کے یہاں آئیں گے "

شوکت حسین ۔ تو نکاح تم بہن بھائیوں نے مل کے کیا ہے مجھے کیا پڑی ہے۔ کہ سو کام چھوڑ کے دوڑا جاؤں؟"

اتنا سُننا تھا کہ کبریٰ بیگم آگ بگولا ہو گئیں۔ اور ایک دفعہ بگڑ کے بولیں" سنتے ہو تم مجھے رہ رہ کے نہ چھیڑا کرو۔ اے تو میں نے کیا بُرا کیا جو ماموں کی بیٹی سے نکاح کر دیا۔ اور لوگو یہ بنا اندھیر ہے کہ یہ تو سب کچھ ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں"

شوکت حسین ۔ بی بی بس اکیلی تمہیں ہی ہو۔ مجھ سے کیا مطلب؟"

کبریٰ بیگم ۔ (بگڑ کے)" دیکھو میں کہتی ہوں۔ میرا منہ کھلواؤ نہیں۔ تو ایک ایک کی بیس بیس سناؤں گی۔ لڑکے کے سب کام تمہارے اختیار ہیں۔ کبھی دخل تک تو دیتی نہیں۔ پڑھانے لکھانے میں جس رنگ پر لگایا۔ تم نے لگایا۔ اس کے کپڑے تم اپنی مرضی کے بناتے ہو۔ اور ساری رسمیں تمہارے کہنے کے بموجب ہوئیں ایک بہن نکاح کر دیا اور بری ہو گئی۔ ہاں بس زیادہ میرے منہ نہ لگو۔ یہیں تو اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔ یہ نہ سمجھو کہ میرا یہاں کوئی بیٹھا نہیں ہے۔ زیادہ ستاؤ گے۔ تو عسکری کو ساتھ لے کے اپنے بھائی کے گھر میں جا کے بیٹھ رہوں گی"

شوکت حسین بھی اس وقت ذرا جھنجھلائے ہوئے تھے۔ ناک بھوں چڑھا کے بولے۔ جاؤ چلی جاؤ۔ میں نے بہت مزاج داری کی اب نہیں ہو سکتی"

میاں کی زبان سے یہ جملہ سُننا تھا کہ بی بی نے سر پر زمین اُٹھائی۔ پاندان اُٹھا کے دھڑ سے انگنائی میں پھینک دیا۔ اور زور زور سے مُنہ پیٹنے لگیں۔ اور ایسا شور و غل مچایا۔ کہ بچے جو گھر میں چاروں کھیلتے تھے دوڑتے ہوئے۔ ماں کے پاس آئے۔ اور لپٹ لپٹ کے رونے لگے۔ یہ رنگ دیکھ کے میاں بھی گھبرا گئے۔ بلکہ گھبرا کیا گئے۔ چونکہ شرافت کا بہت کچھ پاس و لحاظ رہتا تھا۔ اپنے گھر کا یہ رنگ دیکھ کے شرما گئے۔ تاہم اسوقت کچھ بولنا خلاف مصلحت خیال کر کے باہر چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد جب سُن لیا۔ کہ کبریٰ بیگم اچھی طرح رو دھو کے دل کی بھڑاس نکال چکیں تو پھر اندر آئے۔ اور مُسکرا کے کہا۔ بیگم خیر اب گذری باتوں کو بھلا دو بے شک میری غلطی تھی۔ کہ تمہیں آزردہ کیا۔ اب میں جانے کو تیار ہوں۔ جب کہو تمہاری بہو کو جا

لے آؤں گی۔
کبری بیگم۔ نہیں اب مجھ سے نہ بولو۔ مجھے اپنے چپکے پڑا رہنے دو۔
شوکت حسین پاس بیٹھ گئے۔ اور غدر خواہی کے طریقے سے کچھ چھیڑ
اور کچھ گدگدا کے بیوی کو ہنسایا۔ بڑی دیر کے بعد بیوی کا مزاج وقت
خدا خدا کر کے سیدھی ہوئی۔ اور اسی وقت قرار پایا۔ کہ آج کے تیسرے
جمعرات کو شوکت حسین حیدر آباد چلے جائیں۔ اور ہفتہ عشرہ وہاں
بہو کو ساتھ لے آئیں۔
تاریخ معینہ پر شوکت حسین نے مختصر سا اسباب ساتھ لے کے حیدر
کی راہ لی۔ ان بیچارے پر کبھی اس سے پہلے وطن سے باہر قدم نکالنے کی
کاہے کو پڑی تھی۔ یہ بھی جو ر دصدقہ تھا۔ کہ اتنی دور کا سفر کرنا پڑا
ان معاملات میں ناتجربہ کار ہے۔ بلکہ سولہ برس کے بیٹا انگریزی پڑھنے
وجہ سے زیادہ ہوشیار تھا۔ اور حقیقت میں وہ اس کام پر بیٹے ہی کو
تو اچھا ہوتا۔ مگر ایک تو یہ خیال ہوا کہ سال کا آخری زمانہ ہے۔ اور امتحان
بیٹے کو ان دونوں اور مستعد رہنا چاہیئے۔ نہ کہ مہینہ بیس دن بالکل
دیکھنے کا موقعہ نہ ملے۔ دوسرے دل میں یہ بھی خیال گزرا کہ میرے ہوتے
بیٹا اس کام کو جائے۔ ذرا سبکی بات ہے۔
الغرض چلنے کو نادعلیا مظہر العجائب پڑھ کے اور سینکڑوں
ذروں پر بندھوا کے چل کھڑے ہوئے۔ لیکن جو جو آگے بڑھتے اور
کا شور اور ہنگامہ اور لوگوں کی بدحواسی دیکھتے ہوش اڑتے جاتے
تو غنیمت ہوا۔ کہ انگریزی داں بیٹے کے سمجھانے سے دوسرے درجہ
ٹکٹ لے لیا تھا۔ کہیں عام ہندوستانی مذاق کے مطابق تیسرے
کا ٹکٹ لے لیتے تو غضب ہی ہو جاتا۔ خدا جانے کہاں سے
جا پہنچتے۔
خیر بیچارے۔ خدا خدا کر کے حیدر آباد پہنچے۔ چونکہ روانگی کے
تار دیدیا گیا تھا۔ لہذا محمدی ستے آ کر اسٹیشن ہی پر کیا۔ اور ہفتی

گھر نے لئے مگر اسٹیشن پران کو یکہ و تنہا بیک بینی و دو گوش دیکھ کے کچھ چپ سے ہو گئے۔ اور بات یہ تھی۔ کہ مولوی اکبر علی صاحب یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ سمدھی کچھ سامان سے آئیں گے۔ اور بیٹی کو دھوم سے بیاہیں گے۔ بلکہ ساٹھ روپیہ مہینے کا بنگلہ انکے لئے کرایہ پر ٹھہرا لیا تھا۔ اب جو دیکھا کہ اکیلے سمدھی بوریا بدھنا بغل میں دبائے گاڑی سے اُترے تو انہیں نہایت ناگوار ہوا اسٹیشن پر تو دل ہی دل میں جھنجھلا کے رہ گئے۔ مگر گھر میں آکے بیوی سے کہا "سنتی ہو۔ سمدھی صاحب تشریف تو لائے ہیں۔ مگر اس شان و شوکت سے کہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی دیہاتی سمدھیانے لوٹیا ڈوری ہاتھ میں لئے نائی بلانے آتا ہے۔ اسے یہ تو مرد ذات بیچارے سیدھے سادے آدمی ہیں۔ ہماری بہن کو بھی اتنی توفیق نہ ہوئی۔ کہ ذرا سمجھا دیتیں۔"

بلقیس بیگم "مگر بھئی جو کچھ ہو۔ اس طرح تو میں اپنی بدرو کو رخصت نہ کرونگی یہ انہوں نے سمجھا کیا" کوئی لونڈی باندی کی چھوکری سمجھے ہیں۔ جو یوں چپ چاپ ہاتھ پکڑ کے حوالہ کر دی جائے۔

اکبر علی "بھئی ناگوار تو مجھے ہوا۔ مگر دیکھو میں اُن سے ذرا گفتگو کرونگا۔ اور یہ کہ آپ کو جلدی پڑی ہے۔

بلقیس بیگم "میرے نزدیک تو ٹکا سا جواب دیدو۔"

اکبر علی "اے اب نکاح تو ہو چکی ہو۔ معاملہ اُن کے بس کا ہو چکا۔ ایسا بھی نہ کرنا چاہئے کہ کہیں تلم انفا ظ ہو جائے۔"

دوسرے دن اکبر علی نے شوکت حسین سے گفتگو کی۔ اور کہا۔ بھائی صاحب میں یہ نہ سمجھا تھا۔ کہ میری بیٹی کو آپ ایسا ذلیل سمجھ لیں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی رخصت کرانے کا طریقہ ہے؟ نکاح بچپن میں ہو گیا۔ اور باتوں باتوں میں دونو طرف کے ارمان دل ہی دل میں باقی ہیں۔ نہ کوئی رسم ادا ہوئی نہ کسی قسم کی دھوم دھام کی گئی۔ بھلا اس طرح میں لڑکی کا ہاتھ پکڑ کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ تو وہ بھی اپنے دل میں کیا کہے گی یہی کہ اماں باوا نے کوڑے کی طرح گھر سے نکال کر پھینک دیا۔"

شوکت حسین "مجھے تو خیال تھا کہ آپ خود لکھنؤ تشریف لا کے اس رسم کو پورا کریں گے۔ ورا سی وجہ سے کسی بات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

اکبر علی "کیا خوب! بھلا آپ ہی انصاف کیجئے کہ بیاہنے کو آنا لڑکی کا کام ہے یا لڑکے والوں کا"

شوکت حسین "یہ آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر اب تو دنیا سے رسمیں اٹھ رہی ہیں۔ اور سچ عرض کرتا ہوں۔ ان دونوں باتوں میں سے کسی بات کا پابند۔۔۔"

اکبر علی "آپ نہ ہوں نہ سہی زمانہ تو ہے۔ ایک ذرا دینے والے میں کمی ہو جائے تو آپ ہی شکایت کرتے پھریں گے"

شوکت حسین "استغفراللہ! بھائی بخدائے لایزال مجھے ذرا بھی ہوس نہیں۔ میں تو لڑکی کو چاہتا ہوں۔ فقط لڑکی کو روپیہ پیسہ خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے"

اکبر علی "تو بھائی مانا یہ بھی نہ سہی۔ لڑکے کو تو آنا چاہیئے تھا۔ لڑکی ایک نظر دیکھ لیتی۔ صورت تو دیکھ لیتی۔"

شوکت حسین "اس کا ان دنوں پڑھنے کا حرج ہوتا ہے۔ بس اسی وجہ سے نہیں لایا۔ تعلیم کو سب کاموں سے مقدم سمجھتا ہوں۔ اور غالباً آپ کا بھی خیال ہے کہ لڑکی کا آرام و آرائش سے رہنا۔ اور سب طرح کی راحت بس اسی پر منحصر ہے کہ لڑکے کی لیاقت اچھی اور پوری ہو"

اس کے بعد شوکت حسین نے بہت کچھ منت و سماجت کر کے سمدھی کو راضی کر لیا۔ اکبر علی تو کیا ہو گئے۔ مگر آدمی عقلمند تھے۔ سمدھی کو اتنا دبا دیکھ کر زیادہ الجھنا اور جھگڑنا خلاف مصلحت سمجھے اور گھر میں جا کے بیوی سے بیگم میں نے خیال بھر لی۔ بیٹی کی رخصت کا سامان کرو۔ اتنا سنتے ہی بیٹی کا جو خیال آیا۔ تو منہ پر رومال رکھ کے زار و قطار رونے لگے "

بلقیس بیگم "اے لو تم نے مجھ سے بھی نہ پوچھا۔ اتنا کہہ کے وہ بھی رو۔۔۔"

اکبر علی "سمدھی منت و سماجت کرتے ہیں۔ اور ہر طرح کا دباؤ مانتے ہیں۔ اس حالت میں میرے نزدیک زیادہ انکار کرنا بالکل نامناسب ہے"

بلقیس بیگم "آئے لو پوچھو کہ یہ تو مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہوتا۔ کہ میری چپ چپاتی سسرال چلی جائے"

اکبر علی "میں سچ کہتا ہوں۔ کہ زیادہ جھگڑا کرنا نہیں مناسب ہے۔ تم۔۔۔"

ہو۔ جانتی ہو کہ بارہ کو جس گھر میں جانا تھا۔ وہاں کی ہو چکی۔ اس کا بدلنا نہ اب میرے اختیار میں ہے۔ اور نہ تمہارے اختیار میں۔ پھر ان اونے اور بے باتوں کے لئے سمدھیانے والوں سے بگاڑنا اچھا نہیں۔ میرا تمہارا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ سب آئی گئی۔ غریب لڑکی کے سر ہو جائے گی۔ بہر حال اگر یہ چاہتی ہو۔ کہ لڑکی کو آرام ملے۔ تو ان باتوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ۔ اور اسی کو غنیمت سمجھو۔ کہ وہ دباد مانتے ہیں۔ اور اپنی غلطی کا اقرار کر کے عذر خواہ ہوتے ہیں۔

بلقیس بیگم نے اس کے جواب میں بھرائی ہوئی آواز میں اتنا تو کہا۔ کہ تمہیں اختیار ہے " مگر زیادہ نہ کہہ سکیں۔ اور بیٹی سے جو پاس ہی شرمائی اور سر جھکائے بیٹھی تھی لپٹ کے رونے لگیں "

الغرض ہفتے عشرے میں رخصت کی تیاریاں ہو گئیں۔ اور حیدر آباد پہنچنے کے ٹھیک سولھویں دن شوکت حسین بہو کو ساتھ لے کے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ غریب بدر النسا جس نے ریل پر قدم رکھتے۔ بلکہ حیدر آباد چھوڑنے سے پہلے کبھی سسرے کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ انہیں کے ساتھ ماں باپ کے گھر سے نکل کر سسرال کو چلی جو کالے کوسوں تھی۔ پردے کے خیال اور رسموں کی مجبوری سے نہ یہاں حیدر آباد میں شوکت حسین کو جرأت ہوئی۔ کہ سمدھی سے کہیں بہو کو ایک نظر دکھا دیجئے۔ اور نہ خود اکبر علی کو اس کی توفیق ہوئی۔ ریل پر سوار ہو چکنے کے بعد واڑی پہلا مقام تھا۔ جہاں کہ ایک گاڑی سے اترنے اور دوسرے میں چڑھنے کی صورت سے شوکت حسین کو بہو سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہوئی لیکن بدر النسا ایسی شرمیلی لڑکی تھی۔ کہ گھر سے چلتے وقت جو برقع پہنا تو کسی حال میں نہ اتارا۔

خلاصہ یہ کہ شوکت حسین نے برقع کا ایک کونا چٹکی سے پکڑ کے بہو کو نظام لائن کی ٹرین سے اتار کے۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے لائن کی گاڑی میں بٹھایا۔ اور قبل اس کے کہ بہو کی زبان سے ایک لفظ بھی سنیں۔ یا اس کے چہرے سے مسنانے میں پیش آئی۔ اتفاقاً ان دنوں بمبئی میں پلیگ کی شکایت حد سے زیادہ تھی۔ رعایا سہمی ہوئی۔ اور رعایا سے زیادہ ہول گورنمنٹ

کے دا ہیں سماگئی تھی۔ جا بجا اسٹیشنوں پر ڈاکٹر مقرر تھے۔ کہ آنے جانے والے مسافروں اور خاصتہً بمبئی سے آنے والوں کی پوری دیکھ بھال کریں۔

پہلا اسٹیشن تھا جہاں بیچارے شوکت حسین کو مصیبت سے دو چار ہونا پڑا ڈاکٹر نے آنبض دیکھی۔ اور پاس کیا۔ اب بیچاری بہو کی نکر پڑی کو دوڑے راستہ کی تھکی ماندی لڑکی پھر اس پر یہ ہر وقت برقع پہنے رہی گرمی کے سبب سے غریب کا بدن اچھا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے کچھ خوف خدا کر کے پاس کر دیا۔ بخریب یہ ہفت خواں کی پہلی منزل طے کر کے دوسری ٹرین میں بیٹھے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی شمال کی طرف چلی۔

کچھ رات رہے سے مغار کا اسٹیشن چھوڑا تھا۔ اسی دن شام پانچ بجے اٹارسی کے اسٹیشن پر اُترے یہاں کا ہنگامہ سب جگہ سے کچھ زیادہ تھا۔ اور ہمارے سیدھے سادے خوش عقیدہ بزرگ شوکت حسین کو بار بار عرصہ محشر کا خیال آجاتا تھا۔ گاڑی سے اُترے اسباب اُتار کے ایک کونے پر رکھا۔ اسی کے بیچ میں بہو کو بھی ایک میلی کچیلی گٹھری کی طرح لا کے رکھ دیا۔ اور کھڑے ہو کے گھبرا گھبرا کے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ مگر حقیقت میں بہو بڑی صبر والی تھی۔ راستے بھر بھی سُسرے سے اتنا بھی تو نہ کہا۔ کہ پیاس لگی ہے۔ نہ ہی رائچور کی بنی ہوئی چمڑے کی چھاگل جسے حیدرآباد سے بھر کے لائی تھی۔ اس میں سے اونڈیل کے پیتی رہی۔ اور جب بھوک لگتی بسکٹوں کا بکس کھول کے دو ایک کھا لیتی۔ بس یہی کھانا تھا جس پر اس غریب بے زبان لڑکی نے سفر کے تین کڑے۔ دن کاٹے لوگ کہتے ہیں۔ کہ آج کل سفر میں ہر جگہ بڑا آرام ملتا ہے۔ مگر انہیں کو ملتا ہوگا جنہیں ملتا ہے۔ غریب پردے والیوں کے سر پر جو گذرتی ہے۔ اس کا حال کچھ انہیں سے پوچھیئے۔ تو معلوم ہو۔ افسوس اس منحوس پردے خدا کی عدل و رحم اور اسلام کے فیاضانہ برکتوں کو بھی بیکار و بے اثر کر دیا۔ واقعی رسم بڑی بڑی بلا ہے۔ جو ایمان عقاید ہی نہیں۔ انسان کی عقل پر بھی غالب آجاتی ہے۔

بہر تقدیر شوکت حسین یہاں تک آپہونچے۔ اور خوش ہیں۔ کہ کل سلامتی

سے ہوکوے کے گھر پہنچیں گے۔ خیر وہاں تو جب پہنچیں گے۔ ابھی تو اُتاری
کہ اسٹیشن پر منہ پھیلائے۔ بدحواس کھڑے ہیں۔ فرشتۂ موت کی طرح ڈاکٹر کے
منتظر ہیں۔ اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے ہیں۔ ناگاہ
ایک شریف صورت کے آدمی آتے نظر آئے۔ یہ بھی بادی النظر میں پُرانی
وضع کے مسلمان ہیں۔ مگر لکھنؤ کے نہیں کسی اور شہر کے۔ سر پر گول ٹوپی۔
بدن پر ایک لمبا کرتا۔ اور اُس پر بنن سکھ کی صدری۔ پاؤں میں کامدار سلیم
شاہی جوتا گلے میں ایک بادامی رنگ کا منی بیگ اور ایک ہاتھ میں دو تین
چھڑیوں اور چھتریوں کا بندھا ہوا مٹھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں کسی عورت کا ہاتھ
جو سر سے پاؤں تک۔ برقع میں لپٹے ہونے پر بھی جوان بلکہ کمسن معلوم ہوتی ہے۔
پیچھے پیچھے تو اُس عورت کو لئے یہ خود آرہے ہیں۔ اور آگے آگے اسٹیشن کا قلی
ہے۔ جس کے سر پر میلی کچیلی اور بہت بدتمیزی سے بندھی ہوئی گٹھریوں کا
ایک انبار عظیم ہے۔ ان بزرگ کی صورت دیکھ کے شوکت حسین میں ایک
جان سی آگئی۔ اور بڑھ کے پوچھا "کیوں حضرت کیا آپ کانپور تشریف لئے
جاتے ہیں؟" لیکن اُن بزرگ پر شوکت حسین سے بھی زیادہ بدحواسی طاری
تھی۔ چلتے کہیں تھے۔ اور پاؤں کہیں پڑتا تھا۔ نظر ایک طرف تھی۔ اور خیال
دوسری طرف شوکت حسین کے پوچھنے پر اُنھوں نے پھر کے ایک نظر دیکھ تو لیا۔
مگر ساتھ ہی اسباب کا خیال آیا۔ ادھر دیکھا۔ تو قلی اسباب لے کے دو قدم
آگے بڑھ گیا ہے۔ پھر کیا تھا کس کا پوچھنا۔ اور کس کا جواب خوب نے
زبان ساتھ والی کو کھینچتے ہوئے آگے کو لپکے۔ مگر اینچا کھینچی میں اس غریب
کی ایک پاؤں کی جوتی نکل گئی۔ جناب کے قلی کو روکا پیچھے ہٹ کے عورت کو جوتی
پہننے کا موقعہ دیا۔ اور بڑھنے کو تھے۔ کہ شوکت حسین نے بڑھ کے پھر وہی
سوال کیا "آپ کیا کانپور تشریف لئے جاتے ہیں؟" مگر وہ بزرگ اب بھی نہ
سمجھے کہا کیا۔ فرمایا آپ نے؟ مگر کہتے ہی وہ قدم اور آگے بڑھ گئے۔
شوکت حسین۔ قریب جا کے "حضرت! کیا آپ کانپور تشریف لئے
جاتے ہیں؟"

شخص :- جی ہاں "

شوکت حسین :- تو جناب میرے ساتھ بھی زنانہ ہے۔ مناسب ہوگا۔ کہ ہمارے آپ کا ساتھ ہو جائے "

ریل پر جعل سازوں اور فریب دینے والوں کا ہر شخص کو بڑا ہی ڈر رہتا ہے۔ اور اکثر لوگ بڑے بڑے نقصان اٹھا چکے ہیں جسکا نتیجہ ہے۔ کہ بہت کم کسی پر اعتبار ہوتا ہے۔ شوکت حسین نے جو یہ درخواست کی تو ان صاحب نے ان کو سر سے پاؤں تک گھور کے دیکھا۔ اور پوچھا " تو آپ کا اسباب اور مستورات کہاں ہے۔

شوکت حسین :- مستورات کیا معنی صرف ایک میری بہو میرے ساتھ ہے۔ جو دیکھئے (انگلی سے اشارہ کرکے) وہ سامنے اسباب کے پاس برقعہ پہنے بیٹھی ہے۔ اور وہیں میرا اسباب ہے۔

شخص :- اس سے کیا بہتر ہو سکتا ہے۔ کہ سفر میں کسی شریف کا ساتھ ہو جائے۔ جناب کسی پر اعتبار کرتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آپ تو نہایت ہی معزز اور شریف معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی میں ابھی اسی تلاش میں تھا۔ کہ کوئی ایسا ساتھ ہو جائے۔ تو ذرا اطمینان نصیب ہو۔ اور آپ تشریف کہاں لے جاتے ہیں

شوکت حسین :- میں تو لکھنؤ جاتا ہوں۔ اور آپ ؟"

یہ سنتے ہی وہ نئے صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے۔ اور شوکت حسین کو ڈر ڈر کے اشتباہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔

شوکت حسین :- کیوں آپ کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں

شخص :- حضرت برا نہ مانئے گا۔ مجھے لکھنؤ کے نام سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کیا آپ کا بھی وطن وہی ہے۔

شوکت حسین :- جی ہاں۔ خاص لکھنؤ میں۔ مگر آپ کے خوف کا کچھ سبب نہ معلوم ہوا۔

شخص :- سبب کچھ نہیں (مسکرا کے) ہاں فقط اس قدر ہے۔ کہ آپ کے ہم وطن ذرا ہوشیار زیادہ ہوتے ہیں "

شوکت حسین کو یہ پُر معنی جملہ ناگوار ہُوا۔ طعن آمیز لہجہ میں بولے۔ جی ہاں یہ بھی خدا دین ہے۔

شخص "نہیں آپ بُرا نہ مانئے۔ آپ کی تو صورت سے ظاہر ہے کہ شریف باوضع رئیسوں میں ہیں

شوکت حسین "اور آپ نے اپنے وطن مالوف کا پتہ نہ دیا۔ اور نہ فرمایا۔ کہ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

شخص "میں فرخ آباد جاؤں گا۔ پس کانپور ہی تک ہمارا آپ کا ساتھ ہے"

شوکت حسین "اتنی دور کی معیت بھی غنیمت ہوئی۔ مگر آپ تو لکھنؤ والوں سے ڈرتے ہیں۔

شخص "معاف کیجئے آپ کی صحبت کو تو میں فخر سمجھوں گا"

یہ کہہ کے انہوں نے قلی کو پکارا۔ جو ذرا سے آگے ہولیا۔ تو عورت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے چلے۔ اور عزیزہ بدرالنسا کے پاس لا کے اس مصیبت زدہ کو بھی اٹھا دیا۔ اُن کا اسباب بھی شوکت حسین کے اسباب کے پاس رکھوا دیا گیا۔ اور دونوں کھڑے باتیں کرنے لگے۔

شوکت حسین "حضرت اسواریوں کے لے جانے میں ریل پر بڑی تکلیف ہوتی ہے"

شخص "جی ہاں میرے نزدیک تو انسان عورتوں کو لے کے کبھی تنہا سفر ہی نہ کرے۔ ہر ہر قدم پر مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے"

شوکت حسین "بجا ہے۔ اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے۔ اسباب کی خبر لے۔ کہ عورتوں کی تاک رکھے۔ حیدرآباد سے یہاں تک مجھے ایسی ایسی مصیبتوں کا سامنا ہُوا ہے۔ کہ پناہ"

شخص "آپ حیدرآباد سے آتے ہیں؟ اور آپ کا اسم شریف؟"

شوکت حسین "مجھے کو شوکت حسین کہتے۔ اور آپ کا اسم گرامی؟"

شخص "میرا نام قاسم علیخاں ہے۔ ہاں حیدرآباد میں آپ مولوی محب حسین صاحب کو جانتے ہیں؟

شوکت حسین۔ "ہنس کے" ان کی خدمت میں تو نیاز حاصل۔ مگر اوصاف سُن چکا ہوں"

قاسم علیخاں۔ "اور آپ نے ملنے کی کوشش نہ کی؟"

شوکت حسین۔ "جی ہاں مجھے اتنی فرصت نہ تھی"

قاسم علیخاں۔ "میں تو ایک گھنٹہ کے لئے بھی حیدرآباد میں ٹھہرتا تو ان سے جا کے ضرور ملتا"

شوکت حسین۔ (مسکرا کے) معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو اس پردے کے مسئلہ میں ان سے اتفاق ہے۔

قاسم علیخاں۔ "ہاں حضرت میں تو مانتا ہوں۔ آپ ہی انصاف فرمایئے۔ کہ محض پردے کی وجہ سے ہمیں کیسی کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اور بدرالنسا اور اپنی ساتھ والی کی طرف (اشارہ کرکے) ان غریب عورتوں کی کیسی مٹی خراب ہوتی ہے۔ بخدا اس منحوس رسم کو رواج دے کے ہم نے عورتوں کو جانوروں سے بھی بدتر کر دیا۔

شوکت حسین۔ "میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ ہم تو اپنی عورتوں کی اتنی قدر کرتے ہیں۔ کہ شاید دوسری قوم نہ کرتی ہوگی۔ اب اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ انہیں کو اپنی عزت سمجھ لیا ہے؟"

قاسم علیخاں۔ عزت تو ایک خیال محض ہے۔ یوں کہئے۔ کہ مایۂ عزت۔ لہذا جس طرح کسی بڑے موتی یا ہیرے کو آپ سرمایۂ ناز سمجھ کے صندوق میں قفل کرتے ہیں۔ اسی طرح چاہتے ہیں۔ کہ عورت کو بھی مایۂ عزت دے کے ایک ڈبیا میں بند کر لیں۔ اور کمر میں باندھتے رہیں۔ خلاصہ یہ کہ عورت ہے۔ تو بڑے قابل قدر چیز مگر اس کا شمار غیر ذی روح اشیا میں ہے"

شوکت حسین۔ "استغفراللہ! یہ کون کہہ سکتا ہے۔ مگر حضرت بڑی ضروری چیز ہے۔ عفت و عصمت اس کی جیسی نگہداشت پردے میں ہو سکتی ہے۔ بھلا اور کسی طرح ممکن ہے۔

قاسم علیخاں۔ پردے کو رواج دے کے آپ عفت و عصمت کی نگہداشت کرتے ہیں۔ یا شریف زادیوں کے ننگ و ناموس پر ہر وقت سے حملے کراتے

ہیں۔ جو عورت بے پردہ نکلتی ہے۔ اُسے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔ اور پردے سے آپ عورت کو ایسا انگشت نما کرتے ہیں کہ ہر آوارہ اوباش کی نگاہیں اسی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ یہ حفاظت ہوئی یا عصمت کو اور خطرے میں ڈالنا ہوا؟

شوکت حسین۔ یہ پر آپ کیا فرماتے ہیں جب کوئی صورت ہی نہ دیکھے گا۔ تو متوجہ کیونکر؟"

قاسم علیخاں۔ یہ چہرے کھلے ہوتے ہیں تو ہزار میں ایک ایسی ہوگی۔ جس کی طرف نگاہیں اُٹھیں۔ اور چہرہ چھپا کے تو آپ ہر اس عورت کی طرف جو دیکھنے کے لائق نہیں نگاہیں کیا انگلیاں اٹھوا دیتے ہیں"

یہ جوابات سُن کے جب شوکت حسین عاجز آئے۔ تو باوجود کہ بوڑھے سن رسیدہ تھے۔ اور قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے تھے۔ یکایک چہرہ پر جوانی وشہوت پرستی کی مُردہ اور ماند چمک پیدا کرکے اور ایک سوکھا ٹھٹھا لگا کے بولے "پھر کیا ہے۔ اپنے ساتھ والی کا برقع اُلٹ دیجئے دیکھو کیسی ہیں"

یہ بدتہذیبی و بدتمیزی کا جملہ قاسم علی خاں کے دل پر تیر لگا۔ چہرہ غضب آلودہ ہو گیا۔ سچھوری کا جوش آنے کو تھا۔ مگر اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور الفاظ پر زور دے کے بولے "میں تو بیشک اُلٹ دیتا۔ مگر وہ بزرگ جو عورتوں عورتوں کو پردے میں رکھتے ہیں۔ ان کی ناپاک اور بے غیرتی کی آنکھیں مجھے اُٹھنے نہیں دیتیں۔ ہماری عورتیں اتنی ذلیل نہیں۔ کہ ان کے چہروں پر ایسے بیحیاؤں کی نظر پڑے۔ ہاں کوئی ایسا شخص ہو جو اپنی عورتوں کو پردہ نہیں کراتا۔ اس کی نسبت ناپاک نہیں۔ تو میں شک اپنی پاک دامن عورتوں کے چہرے پر سے نقاب اُلٹ دوں گا۔ میں نے جہاں تک غور کیا۔ یہی ثابت ہوا کہ پردے کی وجہ سے ہمارے لوگوں میں صرف دو باتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک الفت دوسرے بدگمانی ان کی نظر ہمیشہ ناپاک اور نیت خراب رہتی ہے۔ اور وہ بات بات پر عورت سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اور دونو باتیں مذہب و اخلاق دونوں حیثیتوں سے نہایت بے شرمی کی اور نہایت ہی قابل نفرت ہیں"

شوکت حسین"خیر جانے دیجئے میں تو مذہب کا پابند ہوں۔ اور اسی

پر عمل کروں گا۔ جو خدا اور رسول کا حکم ہے۔"

قاسم علیخاں: "تو کیا آپ کے نزدیک اس پردے کا حکم مذہب نے دیا ہے؟"

شوکت حسین: (بہت زور سے قہقہہ لگا کے) "تو معلوم ہوتا ہے آپ نے دین میں بھی اصلاح دیدی ہے۔"

قاسم علیخاں: "جناب اصلاح آپ نے دی ہے۔ جو پردہ کراتے ہیں۔ خدا تو صاف کہتا ہے۔ کہ مرد عورت دونو نیچی نظر رکھیں۔ اور اس حصہ جسم کو جس کا کھولنا ضروری ہے۔ یعنی ہاتھ اور چہرے کو کھولے ہوئے باہر کی آمد و رفت کیا۔"

شوکت حسین: (بات کاٹ کے) "قطع کلام ہوتا ہے۔ یہ یقیناً اپنی طرف سے؟"

قاسم علیخاں: "جی اپنی طرف سے نہیں۔ بلکہ حضرت رسول کے ارشاد سے اور ائمہ مجتہدین کے فتووں کے مطابق۔"

شوکت حسین: "تو میں نہ مانوں گا۔"

قاسم علیخاں: "آپ قرآن کو نہ مانئے۔ تو کوئی کیا کریگا۔ میرا کام سمجھانا۔ اور ثابت کر دینا ہے۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔ آپ کو شک ہو۔ تو تفسیر کی جس کتاب میں چاہیئے ملاحظہ فرما لیجئے۔"

شوکت حسین: "واللہ کیا زمانہ ہے۔ رسم و رواج۔ وضع لباس۔ دین و آئین عقیدے اور مسائل ایک دوسرے سے ہر چیز بدلتی چلی ہے! وضع اور صورت دیکھ کے میں آپ کو مسلمان سمجھا تھا۔ مگر آپ تو بڑے نیچری نکلے۔"

قاسم علیخاں: "یوں تو میں ہر بات میں علیگڑھ والوں کے خلاف ہوں۔ مگر آج کل جہاں اور سب نئی باتیں نکلی ہیں۔ وہاں یہ بھی ہے۔ کہ جو ذرا تحقیق کا ارادہ کرے۔ اُسے نیچری بنا دیتے ہیں اور مسلمان تو بہت ہی آسانی سے کافر بنا یا کرتا ہے۔ اگلے دنوں یزید کے کافر بناتے میں بھی دشواریاں پیش آئیں تھیں۔ اور اب ہر سید فاطمی بھی بآسانی کافر بن سکتا ہے۔"

شوکت حسین: "خیر معاف کیجئے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ کہ آپ کو اس مسئلے

میں اس قدر ضد ہے۔ یہ تو فرمائیے۔ کہ یہاں سے گاڑی کب چلے گی ؟"
قاسم علیخاں (تھوڑی دیر ساکت رہ کے) ڈاکٹر کے نیچے سے چھوٹ لیں۔ تو اس امر کو بھی دریافت کریں گے۔ اور یہ آپ کے ہمراہ کون ہیں ؟ افسوس بیچاری کس مصیبت میں ہیں "
شوکت حسین "جی میری بہو ہے۔ اس کے لینے کو حیدرآباد گیا تھا"
قاسم علیخاں (مسکرا کر) حسن اتفاق سے میری حالت بھی اب اسی کی سی ہے۔

اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔ اور وہ نبض دکھاؤ۔ شوکت حسین نے جو اس سے قریب تھے۔ گھبرا کے ہاتھ بڑھایا! اس نے ان کی نبض دیکھی۔ پھر قاسم علی خان کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور جب یہ سنا۔ کہ قاسم علی کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور جب یہ سُنا۔ کہ قاسم علی خان بمبئی سے آتے ہیں۔ تو دیر تک نبض دیکھتا رہا۔ پھر اُن کی زبان اور آنکھیں بھی دیکھیں۔ اور عورتوں کی طرف متوجہ ہُوا۔ پہلے قاسم علیخاں کی ساتھ والی نبض دیکھی گئی۔ اور اس کے بعد بیچاری بدالنسا کی سب نبضیں دیکھ کے ڈاکٹر ذرا سر جھکا کے سوچنے لگا۔ اور ہر شخص دل ہی دل میں ڈر گیا۔ کہ دیکھئے کس کی آ گئی ہے۔ مگر خدا کی کچھ ایسی مہربانی تھی۔ کہ سب پاس ہو گئے۔

اب مزدوروں نے اسباب سر پر اُٹھایا۔ دونوں بے جا کے زنانی گاڑی میں بٹھائی گئیں۔ اور شوکت حسین قاسم علیخاں سکینڈ کلاس کی گاڑی میں برا کے بیٹھے۔ ریل چلی اور دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔ شوکت حسین نے باہر کی طرف سے کہا۔ پارسال بارش نہ ہونے سے دیکھئے۔ زمین کیسی خشک پڑی ہے۔
قاسم علیخاں "جناب اس خشک سالی نے تو قیامت کر دی۔ دیہات میں تو یہ عام ہُوا۔ کہ صدہا گھر اُجڑ گئے۔
شوکت حسین "بے شک بے شک قحط بڑی بلا ہے۔ خدا کرے۔ اب کی برسات بہت اچھی ہو۔ اور ہاں حضرت وہ اُس وقت آپ کیا کہتے کہتے رہ گئے۔ کہ ہماری آپ کی سرگذشت ایک ہی سی ہے ؟"
قاسم علیخاں "جی ہاں میں یہ عرض کرتا تھا۔ کہ مجھے بھی فرخ آباد چھوڑے

صرف پندرہ روز ہوئے ۔ میرے چچا بمبئی میں ہیں۔ جنہوں نے بیس سال یہاں کچھ تجارت شروع کی ۔اور کامیاب ہوئے ۔میرے چچا بمبئی میں ہیں جنہوں نے بیس سال سے یہاں کچھ تجارت شروع کی ۔ اور کامیاب ہوئے ۔چند روز بعد اُنہوں نے کسی ایرانی شخص کی بیٹی سے نکاح کر لیا ۔جس سے صرف ایک بیٹی ہوئی ۔ وہ چاہتے ۔ کہ اس لڑکی کا نکاح کسی طرح اپنی برادری میں کریں ۔مگر کوئی کوئی شخص راضی نہ ہوتا تھا ۔اور بات یہ تھی ۔کہ غیر کفو کی شادی کی وجہ سے سب نے اُن کو چھوڑ ہی دیا ۔ اتفاقاً میرا چھوٹا بھائی ۔ جس کی عمر کوئی بیس اکیس برس کی ہے ۔ باپ سے لڑ کا چلا گیا ۔ اور ان کے پاس بمبئی میں پہنچا ۔اُنہوں نے موقع پا کے اُسے طرح طرح کے سبز باغ دکھائے ۔اور رُوم دلا سا دیکے اپنی بیٹی سے نکاح پڑھوا لیا ۔اور لُطف یہ کہ نکاح تو پڑھوا لیا ۔مگر لڑکے کو کبھی لڑکی کی صورت تک نہ دیکھنے دی ۔بلکہ نکاح کے ہوتے ہی لڑکے کو گھر بھیجدیا ۔اور والد کو خط لکھا ۔کہ میں نے عقد تو کر دیا ہے ۔ مگر لڑکی کی رخصت اُسی وقت ہو گی ۔ جب آپ بُلا لیں گے ۔ والد یہ خبر سُن کے بہت برہم ہوئے ۔ پہلے تو بیٹے کو بہت سی گالیاں دیتے تھے ۔اور ایسی غیر کفو لڑکی کے گھر میں لانے سے سخت انکار تھا ۔ مگر اب دوستوں اور عزیزوں کے سمجھانے سے کس قدر راضی ہوئے ۔ مگر یہ کسی طرح گوارا نہ کیا ۔ کہ خود بمبئی جا کے لڑکی کو رخصت کرائیں ۔ ہاں اتنا کیا ۔ کہ چچا کو لکھ کہو تو کسی کو بھیج کے لڑکی بلا لوں ۔ چچا جو عزیزی کے تعلقات قائم کرنے کے بڑے آرزومند تھے ۔اس کو بھی غنیمت سمجھتے ۔اور جھٹ راضی ہو گئے ۔بہر تقدیر اُن کا خط آتے ہی میں بمبئی کو روانہ کیا گیا ۔ کہ بھاوج کو لے آؤں ۔ پندرہ روز فرخ آباد چھوڑا تھا ۔اور کل سولھویں دن پھر وہاں پہنچ جاؤں گا ۔

شوکت حسین ۔" تو آپ کے ساتھ یہ آپ کی بھاوج ہے ؟"

قاسم علیخاں ۔" جی ہاں چھوٹے بھائی کی بیوی ۔"

الغرض یہی باتیں کرتے کرتے دونوں لیٹ کے سو گئے ۔ بارہ بجے جھانسی اُمٹا کے گاڑی بدلی ۔ اور پھر لیٹ رہے ۔اور دوسرے دن صبح کو کانپور کے اسٹیشن پر تھے ۔ یہ بھی بڑا جنکشن ہے ۔یہاں کا ہنگامہ بھی دیگر مقامات سے کچھ زیادہ ہی تھا ۔

قاسم علیخاں اور شوکت علیخاں دونوں گاڑی سے اُترے۔ اور چونکہ دونوں کو یہاں زیادہ شناسا صورتوں کے نظر آنے کا اندیشہ تھا۔ لہذا سوچ رہے تھے۔ کہ کیا کریں۔ اور سواریوں کو گاڑی سے اُتار کے دوسری دوسری گاڑی تک کیونکر لے جاویں۔ دونوں اسی تردد میں کھڑے۔ کہ کہار ڈولی لئے ہوئے آپہنچے اور پوچھا۔ "ڈولی چاہئے ڈولی!!"

کہاروں کی صورت دیکھتے ہی شوکت حسین اور قاسم علی بے تحاشا چلائے۔ ہاں چاہیئے۔ مگر دو ڈولیوں کی ضرورت ہے۔

کہار "کیئے حاضر ہیں"۔ اور ڈولی کو پلیٹ فارم پر رکھ کے ایک کہار دوڑا گیا۔ اور ایک اور ڈولی لے آیا۔ اب قاسم علیخاں اور شوکت حسین چاندنی لے کے زنانی گاڑی کے پاس گئے۔ اور پردہ کرایا۔ چاندنی کا کونا ایک طرف شوکت حسین نے پکڑا۔ دوسری طرف قاسم علیخاں نے۔ کہاروں نے ڈولی اُٹھائی۔ اور دونوں ہم سفروں نے چلا کے کہا۔ "بے سوار ہو" الغرض دونوں سواریاں دو ڈولیوں پر سوار ہو گئیں۔ اور کہار اپنی سواری کو لے کے الگ الگ کھڑے ہوئے۔ مزدوروں نے اسباب سر پر رکھا۔ اور شوکت حسین قاسم علیخاں سے رخصت ہونے کے لئے بغلگیر ہوئے اس لئے کہ یہی وہ مقام تھا۔ کہ جہاں "ھٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكُمْ" کا مضمون صادق آتا تھا۔ بہر تقدیر دونوں ایک دوسرے کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔ قاسم علیخاں نے فرح آباد کی گاڑی کا راستہ لیا۔ اور شوکت حسین کہاروں اور مزدوروں کے ساتھ دوڑے ہوئے ایک اُونچے لکڑی کے پُل پر چڑھے۔ پھر اُتر کے مغرب کی طرف مڑے اور ادھر روہیلکھنڈ لائن کی ٹرین کے پاس جا پہنچے بہو کو زنانی گاڑی میں سوار کرایا۔ اور خود جا کے اپنی گاڑی میں بیٹھ کے بہت خوش ہوئے۔ کہ منزل کٹنے کو آئی۔ اور اب دو تین گھنٹے میں لکھنؤ کے اسٹیشن پر ہوں گے۔ جہاں بیٹا اور بہت عزیز و قریب موجود ہوں گے۔

اور یہی ہوا کہ بلکہ اُن کی اُمید سے زیادہ ہوا۔ اس لئے کہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر کبری بیگم کی آرزو اور ارمان کا رنگ نظر آیا۔ کہ اسٹیشن پر صرف عزیز و قریب ہی نہ تھے۔ بلکہ بیٹا عسکری دولھا بنا زریں لباس پہنے ویٹنگ روم میں تھا۔ برادری کے لوگ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ زربفتی پوشش اور مقیشی جھالر

کی فنس دلھن کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اور اسٹیشن کے باہر تو تاشے اور ڈھول باجے والے انگریزی باجے والے نوبت نقارہ روشن چوکی اور جھنڈی برادر۔ غرض ایک ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔ اور برات کا کافی سامان نہ تھا۔ جو نہ ہو۔ پردہ ہوا دلھن فنس میں سوار ہوئی۔ کہاروں نے بسم اللہ کہہ کے فنس اٹھائی۔ اور برات تڑ تڑ جھیم کرتی ہوئی۔ دھوم دھام سے شہر کو روانہ ہوئی۔ کوئی دو گھنٹے میں برات آغا میر کی ڈیوڑھی پہنچی۔ جہاں شوکت کا گھر تھا۔ برات کے پہنچتے ہی گھر میں طبلہ ٹھنکنے لگا۔ ڈومنیوں نے ہمیشہ دلبر سبحان مبارک باشد" کا نغمہ بلند کیا۔ بڑے خوش وخروش سے دلھن اتاری گئی۔ چند کمسن لڑکیوں نے دلھن کو لے جا کے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ جو سونے کا کمرہ یا حجلۂ عروسی قرار دیا گیا تھا۔ تھکی ماندی دلھن تو جاتے ہی لیٹ کے سو رہی مگر گھر میں آدھی رات تک دھوم دھام اور شور و ہنگامہ رہا۔ ایک بجے کے قریب جب لوگوں کی بانگ پکار کم ہوئی۔ تو ایک لڑکی نے چپکے سے عسکری کو وہاں پہنچا دیا۔ اور سب لیٹ کے سو رہے۔

تیسرا باب
انجام

شوکت حسین تو بہو کو لے کے گھر پہنچ گئے۔ اب ذرا لگے ہاتھوں قاسم علی خاں کی بھی سرگذشت سن لیجئے۔ وہ کانپور سے سوار ہو کے چند گھنٹے میں فرخ آباد جا پہنچے۔ جہاں ایک اُن کا چھوٹا بھائی کاظم علی خاں تھا البتہ فنس لئے موجود تھا۔ باقی برادری بھر میں اور کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی۔ کہ اس کے کام میں شریک ہو۔ دونو بھائیوں نے مل کے لڑکی کو ریل سے اُتارا۔ گھر کا خدمتگار جو کاظم خاں کے ساتھ مارے باندھے اسٹیشن تک چلا آیا تھا۔ وہ تو

کے ساتھ دوڑتا ہُوا روانہ ہُوا اور قاسم علی خاں و کاظم علی خاں نے باوا کی بہلی پر بیٹھ کے گھر کی راہ لی بیل تیز تھے۔ فنس سے پہلے پہنچ گئے۔ لیکن بہو کے اترتے وقت ڈیوڑھی پر سناٹا ہی تھا۔ بس ٹُرّوں ٹُوں بھی دونوں بھائی تھے۔ جنہوں نے نئی بار خاطر دُلھن کو اُتارا۔ اور ایک کمرے میں لیجا کے بیٹھا دیا۔ جہاں کوئی بات پوچھنے والا تک نہ تھا۔

بات یہ تھی کہ کاظم علی و قاسم علی خاں کے والد ہاشم علی خاں اس شادی سے بہت ہی ناخوش تھے۔ لوگوں کے کہنے سُننے اور آشناؤں کے سمجھانے بجھانے سے بڑے بیٹے کو نہ بھیج تو دیا۔ کہ جا کے بھاوج کو لے آؤ۔ لیکن اُن کے دل سے مَیل نہ نکلا تھا۔ بیٹے کے جا چکنے کے بعد جو جو خیال آیا۔ کہ غیر کفو لڑکی گھر میں آتی ہے۔ برہمی زیادہ ہو جاتی تھی۔ ایک دیہاتی مذاق کے اُجڈ آدمی تھے۔ بس جہاں کوئی رائے قائم ہو گئی۔ پھر وہ پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اور اُن پر کیا موقوف ہے۔ ماشاءاللہ سے سارا گھرانا ایسا ہی واقعہ ہُوا تھا۔ بس اکیلے ایک قاسم علیخاں ہیں تو ذرا انسانیت سی۔ اور ملنساری تھی۔ جس کی وجہ زیادہ یہ تھی۔ کہ اُن کا زیادہ تر قیام گھر سے دُور دُور شہروں میں ہُوا تھا۔ خصوص ایک سال ہی گذر کے بورڈنگ ہوس میں رہنا۔ ان کے حق میں اکسیر ہو گیا تھا۔ علیگڑھ کالج میں اُن کے پدر بزرگوار اپنی مرضی سے تو کیوں جانے دیتے۔ لیکن یورپین صاحب ضلع نے مجبور کر کے بھیجدیا تھا۔ اور اسی کی برکت تھی۔ کہ سارے گھر اگر کسی میں انسانیت تھی۔ تو اُن میں مگر ذہن کچھ ایسا کند پایا تھا۔ کہ پورے سال بھر تک پڑھنے پر بھی انگریزی کا ایک حرف نہ آیا۔ ہمیشہ کرکٹ ہی کھیلا کئے۔ باقی "در این خانہ تمام آفتاب است" کا مضمون تھا۔ کسی میں اتنا مادہ نہ تھا۔ کہ معاملہ کے نیک و بد پر ذرا غور کر کے رائے قائم کرنے پر چھوٹے صاحب زادے جو بمبئی کے بے زبان غریب الوطن کے دولھا تھے۔ بالکل باپ پر پڑے تھے۔ وہی ضدو ہی ہٹ وہی سخن پروری۔ وہی شتر کینی۔ بس ہُو بہُو وہی سب باتیں نے لئے۔ باوا نے چھوڑی اور بیٹے نے اُٹھائی۔ بیٹے نے چھوڑی اور باوا نے اُٹھائی۔ ہر وقت موچھوں پر تاؤ ہی دیتے رہتے۔ جب رائے قائم

ہو جاتی پتھر کی لکیر تھی۔ اور پھر ضد کہ نہیں اسی وقت تعمیل۔ اور کبھی خدا نخواستہ ذرا مخالفت کر دیجئے۔ تو لٹھ باندھے پھرتے ہیں۔ خون کے پیاسے ہو گئے۔

باپ بیٹے کا مزاج اگرچہ ایک طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ مگر اس قسم کے دو مزاجوں میں جو کبھی اتفاق نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ یہ تھا۔ کہ صاحبزادے کی رائے ہمیشہ باوا کے خلاف رہتی۔ اور باوا تو بیٹے کے پیچھے ہی پڑے رہتے تھے۔ یہ شادی چونکہ خود صاحبزادے کی حماقت کا نتیجہ تھی لہذا اڑے ہوئے تھے۔ کہ بھائی بیوی کو گھر میں بلا کے رکھو۔ لیکن جو جوان کی ضد بڑھتی جاتی وہ باوا بھی اور ضد پاتے جاتے یہ وہ کہتے ہرگز نہیں۔ دیکھوں تو کیسے گھر میں لاتا ہے"۔

خیر لوگوں نے کوشش کی۔ خدا خدا کر کے بڑے میاں کو راضی کیا۔ اور کہہ سن کے قاسم علیخاں کو بمبئی روانہ کر دیا۔ مگر بھائی کے جاتے ہی میاں کاظم علیخاں نے اپنی کامیابی پر کچھ ایسی اکڑفوں دکھائی۔ اور اپنے پرائے کے سامنے اس طرح بڑھ بڑھ کے باتیں بنائیں۔ کہ باوا کے کانوں میں بھنک پہنچ گئی۔ وہ سنتے ہی بگڑ گئے۔ اور کہا " خیر اب قاسم گیا ہے۔ تو لاوے ہی گا۔ مگر میں نہ گھُسنے دونگا۔ اور نہ میرے گھر میں کوئی ملے گا۔ اس طرف کا مکان خالی کرا دو۔ اور کاظم سے کہو۔ اپنے وہیں اُتارے اور دیکھو۔ خبردار درمیان کا دروازہ نہ کھلنے پاوے۔ اور نہ یہاں سے کسی قسم کی ہم ملت رہے۔ اب بھلا اس نادری حکم کی کون مخالفت کر سکتا! ماں بہنیں شائد کچھ تدبیر کریں۔ مگر ہم ایسے خاندان ہیں۔ جن کے مرد اس مزاج و طینت کے ہوں۔ غریب عورتوں کو سوا بیٹھے بیٹھے ہر طرح باتیں سُن لینے کے لب ہلانے کی مجال تو ہوتی نہیں۔ ذرا بھی چوں کی۔ اور خانصاحب کو غصہ آ گیا۔ اور خانصاحب کے غصے کا قاعدہ ہے۔ کہ ہمیشہ ضعیف و ناتوان پر آتا ہے۔

بہر تقدیر بہو کے آتے آتے منجھلے چھوٹے خانصاحب نے ایسے سامان فراہم کر رکھے تھے۔ کہ جس وقت بہو آ کے سسرال میں اُتری کوئی کھڑا نہ ہونے والا نہ تھا۔ پرندہ پر نہیں مارتا تھا۔ اور ہر طرف سناٹا پڑا ہوا تھا۔ اب بیچاری بہو کمرے میں اکیلی بیٹھی ہے۔ اور منتظر ہے۔ کہ ساس نندوں میں سے کوئی

تو آئے گا۔ مگر غریب کو گھڑیاں گنتے گنتے شام ہوگئی۔ اور نہ کوئی اب آیا ہے۔ اور جب آتا ہے۔ اور آئے تو کون آئے۔ جانے والوں میں سے جو کوئی تھے۔ وہ یہی دونوں بھائی تھے۔ ان میں سے بڑے نے گھر پہنچ کے جب اس برہمی اور کی خبر سُنی اور کچھ تو نہ بن پڑا۔ سیدھے باوا کے پاس دوڑے گئے۔ اور خوشامد کرنے لگے۔ کہ بلٹد اس وقت معاف کر دیجئے۔ وہ غریب لڑکی اکیلی پڑی ہے۔ اور کوئی بات کرنیوالا نہیں۔ اگر قصوروار ہے۔ تو کاظم ہے" اس غریب ناکردہ گناہ نے کیا قصور کیا ہے۔ جو آپ اُس پر بھی ترس نہیں کھاتے" مگر سُنتا کون تھا! بڑے خانصاحب خفا ہوں۔ تو کس کے منائے منتے ہیں؟ اور چھوٹے بھائی نے جب یہ حال دیکھا تو ڈر کے مارے یہ توفیق تو کاہے کو ہوتی۔ کہ باپ کے آگے جاکے ہاتھ جوڑیں اور معذرت خواہ ہوں۔ اسے تو یہ بات ہیں فرق ہوجائے۔ اپنی دُلہن کو اکیلا بٹھا کے شہر کی گلیوں میں خاک اُڑاتے لگے۔ کہ ایک رات کو کسی دوست ہی کی بی بی کرائے پر ملجائے؟ سوار کرلائیں۔ اور یہ بھی نہیں تو کوئی اصیل ہی سہی۔ مگر بدحواسی کا خدا بھلا کرے سارے شہر میں منہ پھیلائے ہوئے پھرے۔ اور کوئی نہ ملا۔ آخر جھٹ پٹے وقت چراغوں میں بتی پڑ رہی تھی۔ کہ راہ چلتے ایک لنگڑی اور بیمار بڑھیا ل گئی جسے لئے ہوئے گھر میں آئے۔ اور اندر جاتے ہی نہایت تحکمانہ لہجے میں لنگڑی بڑھیا کو تیموری حکم ہؤا۔ کہ جلدی چراغ جلا۔ ماما چراغ کے ڈھونڈنے کو مڑی ہی تھی۔ کہ آپ نے ایک سسکی بھر کے پانوں پھیلا دیئے۔ اور کہا "واللہ آج تھک گیا۔ پھر بی بی کی طرف دیکھ کے کہا جو بیچاری گھونگھٹ نکالی سر جھکائے بیٹھی قسمت کو رو رہی تھی۔ اور دیکھ کے کہا" بیٹھی کیا کرتی ہو؟ ذرا پاؤں تو دبا دیں"

یہ فرمائش ایک ستم آلود تیر کی طرح بے زبان لڑکی پر پڑی۔ مگر شریف زادی تھی۔ اور چلتے وقت ماں کی زبان سے یہ سُن آئی تھی۔ کہ بیٹی وہ باوا کا گھر نہیں لونڈی بن کے رہوگی۔ تب بناہ ہوگا" قہر درویش بر جان درویش دل ہی دل میں روتی ہوئی اُٹھی۔ اور پاس آکے مہندی لگے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ جس پر کاظم علیخاں نے کڑک کر کہا "ابجی زور زور سے دباؤ۔ پٹھان

کی بیٹی ہو۔ اور اتنی بھی طاقت نہیں؟"
اس جملہ کیا تھا ہی پاؤں دباتے بہو کے ہاتھ رُک گئے۔ اور اُس نے سر اُٹھا کے گھونگھٹ ہی کی آڑ میں سہی۔ مگر کوشش کی۔ کہ میاں کو ایک نظر دیکھ لے۔ لیکن نظر کیا خاک آتا۔ اچھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ اور چراغ نہ آج آتا ہے۔ نہ کل۔ اتنے میں لنگڑی ماما نے چلا کے کہا۔ میاں مجھے تو کہیں چراغ نظر نہیں آتا۔ ذری آپ اُٹھ کے بتا دیجئے۔ تو روشن کروں" یہ سُن چھوٹے خاں صاحب کو ہوش آیا۔ کہ گھر میں چراغ تو ہی نہیں۔ بڑھیا کو ملے تو کہاں سے؟ کسی قدر برہم ہو کے بولے "بھئی اب ذری ذری سے کام کو ہمیں دوڑیں تو کام چلے یہ کہہ کے باہر چلے گئے۔ کہ کہیں سے ایک چراغ بھی مانگ لائیں۔ رات تو کسی طرح کٹ جائے تو صبح کو دیکھا جائے گا۔
کاظم علیخاں تو ادھر اُدھر باہر گئے۔ لیکن ادھر دُولھن کا اب یہ خیال ہے۔ کہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہے۔ جیسے لرزہ چڑھ آتا ہے۔ آخر مجبور ہو کے بے حیائی سے زبان کھولی۔ اور بڑھیا کو جو تھوڑے فاصلے پر کھمبا پکڑے۔ اور ایک ٹانگ ٹیڑھی کئے کھڑی تھی۔ کانپتی ہوئی آواز سے پکار کے اپنے پاس بلوایا"
بڑھیا۔ (تعجب سے) اے آپ نہیں جانتیں؟ پٹھان واڑہ ہے"
بہو۔ (سہمی ہوئی آواز سے) اور شہر"
بڑھیا۔ لو بیوی تمھیں یہ بھی خبر نہیں۔ کیا ابھی ابھی کہیں سے بھاگی چلی آتی ہو۔ فرخ آباد اور کون سا شہر ہوتا"
بڑھیا نے یہ کہنا تھا۔ کہ بہو نے ایک چیخ ماری اور غش کھا کے گر پڑی۔ بہو کو اس حال میں دیکھ کے بڑھیا کے حواس جاتے رہے۔ گھبرا کے غریب الوطن لڑکی کے چہرے کی طرف جھکی۔ اور بار بار کہتی۔ بیگم! اے کیا! ارے اللہ کچھ منہ سے تو بولو۔ پھر گھبرا کے اپنے سڑے ہوئے بدبودار دوپٹے کے آنچل سے ہوا دیکے بولی۔ اے ہے! یہ کیا میرے کہنے سے ہو گیا"
بس وہی بھاگنے کا لفظ ناگوار ہوا۔ اے میری کیا شامت تھی۔ جو ایسا لفظ

زبان سے نکالا؟"

اتنے میں کاظم علیخاں چراغ ہاتھ میں لئے ہوئے آگئے۔ اور یہاں کا یہ خوفناک سین دیکھ کے ڈر گئے۔ پوچھا یہ کیا ہوا؟" یہ جملہ کہتے ہوئے جھپٹے اور چراغ پاس لے جا کے دلھن کا منہ دیکھا۔ تو نظر آیا۔ کہ آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں۔ دانت بیٹھ گئے ہیں۔ سر سے پسینے میں عرق اور پڑی الٹی سانس لے رہی ہے۔ یہ حالت دیکھ کے کاظم علیخاں جیسے اپنے ہوش ہی کھوتے چراغ طاق پر رکھا۔ ساتھ ہی بڑھیا کی طرف خیال کیا۔ اس لئے کہ آتے وقت اُسے کسی بات کے کہنے پچھتاتے سُنا۔ ایک بدگمانی کی نگاہ سے اسے گھور کے دیکھا۔ اور ڈپٹ کے کہا بتاؤ یہ کیا ہوگا؟"

بڑھیا۔ میاں مجھ سے قسم لے لیجئے۔ جو میں نے کچھ کہا ہو۔ بس اتنا کہا تھا۔ کہ جملہ پورا نہیں ہونے پایا تھا۔ کہ چھوٹے خانصاحب کا تھپڑ اس زور سے پڑا کہ منہ پھر گیا۔ اور زبان دانتوں کے بیچ میں کچل کے کٹ گئی۔ خون تھوکنے کیلئے جھکی ہی تھی۔ کہ ایک گھونسا اس زور سے اس کے بائیں پہلو پر پڑا۔ کہ بے اختیار دونوں ہاتھ وہاں پر رکھ لئے۔ اور گر پڑی صرف ایک دفعہ اُف کا لفظ تو اس کی زبان سے نکلا۔ اور پھر جو دیکھا۔ تو بڑھیا میں کچھ نہ تھا۔ مگر آپ اُس پر گھونسے اور لاتیں ارتے ہی چلے گئے۔ اور جب دیکھا۔ کہ بڑھیا روتی چلاتی نہیں۔ تو چراغ لے کے اس کی صورت دیکھی۔ اور خیال کرتے ہی حواس باختہ ہو گئے۔ کہ بڑھیا کی سانس نہیں چلتی۔

بڑھیا کے مرنے کا یقین ہوتا تھا۔ کہ کاظم علی خاں کے سب حواس غائب ہو گئے۔ فوراً خیال آیا۔ کہ مجھے بھی پھانسی ہوگی۔ اور اب دنیا میں چند ہی ساعت کا مہمان ہوں۔ انہیں اُس وقت ہر طرف موت ہی موت نظر آتی تھی۔ وہ رہ رہ کے جی اکڑا کرتے ہیں مگر ہر مرتبہ خوف غالب آجاتا ہے۔ اور سر سے پاؤں اُچھل پڑتے ہیں۔ حقیقت میں وہ گھر جس میں ایک طرف بی بی پڑی نزع کی سی سانسیں لے رہی تھیں۔ اور دوسری طرف خود اُن کے ہاتھ کی مقتولہ کا مظلومانہ چہرہ چراغ کی دھندلی روشنی میں زبان حال سے

انتقام کا لفظ پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔ کاظم علی خاں کے لئے ایک مقام بن گیا تھا۔ جہاں اُنہیں ہر چار طرف یہی نظر آیا۔ کہ جیسے صدہا بھوت اور دیو نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور اُن کی طرف منہ پھیلا کے دوڑے ہیں۔ اب اُن کا سر چکر کھانے لگا۔ اور معلوم ہوا۔ کہ جیسے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جاتی ہے۔ گھبرا کے بیٹھ گئے۔ مگر ساتھ ہی یاد آیا۔ کہاں بیٹھے ہو۔ پولیس گرفتاری کو آیا ہی چاہتا ہے۔ پھر کیا تھا۔ ہر چیز کو اسی حال میں چھوڑا اور گھر سے نکلے چلے گئے۔ بدحواسی میں اتنا بھی ہوش نہ آیا۔ دروازے کے پٹ بھیڑ دیں۔

دیر کے مصیبت زدہ اور بدنصیب لڑکی کو ہوش آیا۔ اُس نے پڑے ہی پڑے آنکھیں کھولیں۔ اور ناتواں آواز سے بڑھیا کو پکارنا شروع کیا۔ مگر وہ اس دنیا میں ہو تو بولے۔ جب پکارتے پکارتے تھک گئی۔ تو بیچاری آہستہ آہستہ اُٹھی اور دیکھا۔ تو بڑھیا دونوں ہاتھ بائیں طرف سینے پر رکھے اوندی پڑھی ہے۔ ڈرتے ڈرتے پاس گئی۔ اور جب وہ بلانے چلانے سے بھی نہ بولی۔ تو جھک کے اس کی صورت دیکھی۔ اور صورت دیکھنا تھا۔ کہ ایک چیخ ماری اور خود بھی بڑھیا کی لاش کے برابر بیہوش ہو گئی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک یہاں یہی سین رہا۔ کہ غریب لڑکی کو پڑے پڑے غش سے افاقہ ہوتا ہے۔ آنکھ کھولتی ہے۔ بڑھیا کی لاش دیکھتی ہے۔ اور پھر چیخ مار کے بیہوش ہو جاتی ہے۔

کوئی ساڑھے نو کا وقت ہوگا۔ کہ بڑے بھائی قاسم علی خاں بھاوج کی خبر لینے کو آئے۔ اور بات یہ ہوئی۔ کہ سر شام تک وُہ باپ کی منت وسماجت ہی کرتے رہے۔ کہ بہو کو ساس نندوں سے ملنے دیجئے۔ اور جب کسی طرح نہ شنوائی ہوئی۔ تو خیال کیا۔ کہ چھوٹا کھانے پینے کا کیا۔ خاک انتظام کر سکے گا۔ دوڑے ہوئے ماں کے آئے۔ اور کہا آپ نہیں ملتی ہیں نہ ملئے۔ مگر کھانا بھجوا دیجئے۔ دونوں کے دونوں گھر میں بھوکے پڑے ہیں۔ اب یہ بھی نہ کیجئے۔ کہ بہو کو پہلی ہی رات فاقہ ہو جائے۔ ماں نے پہلے تو بدرود کے میاں کا خوف ظاہر کیا۔

پھر اس بات کی تاکید کر کے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ کھانا نکلوانے لگیں۔ لیکن قاسم علیخاں احتیاطاً پہلے ہی چلے گئے کہ دیکھیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہاں پہنچے تو کچھ اور ہی عالم نظر آیا۔ ایک طرف ایک بڑھیا مری پڑی ہے۔ اُس کے برابر ہی بھاوج بیہوش پڑی ہیں۔ اور مکان میں ہُو کا عالم ہے۔ یہ وحشت انگیز سماں دیکھ کے قاسم علیخاں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھائی کے مزاج سے واقف تھے۔ دل میں سمجھ گئے۔ کہ یہ ساری کارستانی اُنہیں کی ہے۔ مگر آدمی عقلمند اور سمجھ دار تھے۔ اُلٹے پاؤں باہر آئے۔ اور دوڑے ہوئے ماں کے پاس جا کے اُن کو علیحدہ لے گئے۔ ساری سرگذشت بیان کی اور کہا اب میں تو اِدھر کا دروازہ کھول کے بھاوج کو یہاں لئے آتا ہوں۔ آبا جان چاہے مار ڈالیں۔ مگر یہ تو نہیں دیکھا جاتا۔ کہ لاپروائی ہی میں ایک غریب کی جان جاتی رہے۔ ماں یہ سُن کے سہم گئیں۔ قاسم علیخاں نے ماماؤں کو کسی نہ کسی بہانے سے اِدھر اُدھر ٹال دیا۔ اور چپکے سے دروازہ کھول کے گئے بھاوج کو گود میں اٹھایا۔ اور لا کے اپنی بڑی بہن کے پلنگ پر لٹا دیا۔ پھر رات ہی کی اندھیری میں لاش کو لیجا کے۔ ایسے مقام پر ڈالدیا۔ جہاں سے اُن کے گھر پر کسی کا خیال ہی نہ جائے۔ غنیمت ہُوا کہ لاش لیجانے وقت اُن پر کسی کی نظر نہ پڑی اور بالکل تنہائی اور خموشی میں پوری کاروائی کر سکے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی لاش پر لوگوں کی نظر نہ پڑ گئی۔ اور پولیس افسروں کے ساتھ ہزارہا خلقت کا ہجوم ہو گیا۔ مگر پتہ نہ آج تک لگا ہے۔ اور نہ اُمید ہے۔ کہ کبھی کسی کو خبر ہو گی۔ صرف کاظم علیخاں کے یکایک غائب ہو جانے پر لوگوں کو ذرا شک پیدا ہُوا تھا۔ مگر باپ بیٹے کی ناراضگی کا جھگڑا پیش کر دیا گیا۔ اور ساری بدگمانی دُور ہو گئی۔

بہو جو اُس مکان سے اُٹھ کے آئی۔ تو اب اُسے کسی طرح ہوش نہیں آتا۔ بڑے خاں صاحب کو بھی خبر ہو گئی۔ اوّل تو وہ بگڑے۔ مگر جب بی بی اور بیٹے نے ساری سرگذشت بیان کی۔ تو وہ بھی خاموش ہو رہے۔ اور ڈرے کہ اب اس معاملے کو زیادہ طول دُوں گا۔ تو خود بھی ماخوذ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ بہو کو برابر لخلخے پر لخلخہ سونگھا جاتا ہے۔ سَو سَو طرح کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ مگر غش کو افاقہ نہیں ہوتا۔ اب زور شور سے بخار بھی چڑھ آیا۔ اور

خوف ہو گیا۔ کہ کہیں سرسام نہ ہو جائے کاظم علیخاں کا تو پتہ نہیں۔ بیچارے قاسم علیخان نے بڑی دوڑ دھوپ کی مگر اس رات کی صبح سے پھر شام ہو گئی۔ اور لڑکی نے نہ اسوقت تک آنکھ کھولی ہے۔ اور نہ منہ میں گیا ہے۔

شام کو سب لوگ اُنہیں پریشانیوں میں تھے۔ کہ ناگہاں آدمی نے پکارا قاسم علیخاں دوڑے باہر گئے۔ اور دروازے پر ایک چپڑاسی کو دیکھ کر سہم گئے کہ کہیں گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں لایا۔ اور حقیقت میں ان دنوں ان کی بات بات پر وحشت ہوتی تھی۔ وہ تو غنیمت ہُوا۔ کہ ان کی زبان سے کوئی بدحواسی کا کلمہ نہیں نکلنے پایا تھا۔ کہ چپڑاسی نے کہا۔ آپ کے نام ایک تار آیا ہے۔

قاسم علیخاں " تار کہاں سے "

چپڑاسی " اب یہ تو پڑھوانے سے معلوم ہوگا۔ مجھے کیا خبر "

قاسم علیخاں " مگر میں سمجھتا ہوں نہیں دھوکا ہُوا ہے۔ مجھے کون تار بھیجے گا۔

چپڑاسی " اب جو کچھ ہُوا ہے۔ یہ تو آپ ہی کے نام (تار پڑھا کے) لیجئے۔ دستخط کیجئے۔

قاسم علیخاں نے اسی سے پوچھ پوچھ کے منسلکہ فرد کو دستخط کر کے واپس کیا۔ چپڑاسی رسید لے کے واپس ہُوا۔ اور انہوں نے لفافہ چاک کیا۔ مگر تار انگریزی میں تھا۔ پریشان ہوئے۔ کہ پڑھے گا کون؟ پڑوس میں ایک بڑھئی کا لڑکا انگریزی پڑھتا تھا۔ دوڑے ہوئے اُس کے پاس گئے۔ اور کہا " بیٹا وزی یہ تار تو پڑھ دینا " لڑکا تار کھول کر غور کرنے لگا۔ اتنی دیر میں قاسم علیخاں نے کہا۔ یہ بتاؤ کہ یہ آیا کہاں سے ہے ؟ "

لڑکا " بمبئی سے "

قاسم علیخاں " اور بھیجا کس نے ہے "

لڑکا " ناظم علیخاں سوداگر نے "

قاسم علیخاں ۔ ہاں معلوم ہُوا " چچا جان نے بھیجا ہے۔ ہاں۔ بیٹا پڑھو

کے اور یہ بھی جلدی بتاؤ۔ کہ کیا لکھا ہے۔

لڑکا۔ لکھا ہے۔ اِتنا کہا۔ اور غائب پھر کچھ سوچ کے ڈرتے ڈرتے بولا۔ لکھا ہے۔ کہ تمہاری بھاوج بدل گئیؔ اور؟"

قاسم علیخاں اگرچہ گھرانے بھر میں نیک اور معتدل المزاج واقع ہوئے تھے۔ مگر پھر بھی آخر پٹھان کے بیٹے تھے۔ اتنا بڑا حملہ سن کے اُن کو تاب کہاں اور پھر ایک بڑھی کے لونڈے کی زبان سے زیادہ نہیں کہنے پایا تھا۔ کہ اُنہوں نے اس زناٹے سے ایک لپورسید کیا۔ کہ اُس کا سر پھر گیا تھپڑ کھاتے ہی اُس نے تار کو زمین پر پھینک دیا۔ اور گالوں کو ہاتھ سے جلدی جلدی سہلاتا ہُوا بھاگا۔ اس کے جانے کے بعد قاسم علیخاں تھوڑی دیر تک تو اپنے غصّے کا آپ ہی خمیازہ بھگتتے رہے۔ پھر تار اُٹھا لیا۔ اور یہ سوچتے ہوئے چلے۔ کہ اب کس کے پاس جائیں۔ اسٹیشن قریب تھا۔ دل میں کہا چلو۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پڑھوائیں؟"

بہر تقدیر وہاں پہنچے اور تار ریل کے بابو کے ہاتھ میں دیا۔ بابو بھی تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اور چند لمحوں کے بعد بولا" اس میں لکھا ہے۔ کہ تمہاری بھاوج بدل گئی۔ جلد لکھنؤ جاؤ۔ اور شوکت حسین سے جن کا اٹارسی سے کانپور تک تمہارا ساتھ رہا۔ لو۔ محلہ آغا علی میر کی ڈیوڑھی میں رہتے ہیں۔

قاسم علی خاں اب بھی بگڑ بیٹھنے کو تھے۔ خصوصاً اس مضمون پر اسٹیشن ماسٹر کو ہنستے دیکھا۔ تو آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ جب کانپور میں دونوں سواریاں ڈولی پر اُتری تھیں۔ یہ خیال آنا تھا۔ کہ کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اور بالکل از خود رفتہ ہو گئے۔ ایک تردد کے حالت میں کھڑے تھے۔ کہ بابو نے مُسکرا کے پوچھا۔ سمجھا؟؟"

قاسم علیخاں۔ بڑے تامل کے ساتھ، جی ہاں سمجھا تو؟"

بابو۔ مگر ہم نہیں سمجھا۔ اس کا کیا مطلب۔ مطلب کہ تمہارا بھاوج

[illegible] موافق گیا"

"**قاسم علیخاں** - اب میں ابھی بے دریافت کئے تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر لکھنؤ کے ایک صاحب حیدر آباد سے آئے تھے۔ کانپور تک میرا اُن کا ساتھ رہا۔ اُن کی بہو اور میری بھاوج زنانی گاڑی میں ساتھ تھیں۔ شائد ایسا ہُوا ہو کہ کانپور میں ڈولی پر سوار ہونے کے بعد میری بھاوج کی ڈولی اُن کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اور ان کی بہو کی ڈولی میرے ساتھ چلی آئی ہو"

بابو۔ بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کر کے) تو آپ اپنا بھاوج کو پہچانتا۔ تو اُس کا میاں اپنا جورو کو بھی نہ پہچانے گا۔ اتنا کہہ کے اُس نے جو ہنسنا شروع کیا۔ تو ہنستے ہنستے بیدم ہو گیا۔ آخر بڑی بڑی مشکلوں سے ہنسی کو روک کے بولا۔ واہ آپ کا پردہ بڑے مزے کا بات ہے۔ کہ لوگ چپکے ہی چپکے جورو بدل لیا کرے اور کوئی ہوتا۔ تو قاسم علیخاں سینے پر چڑھ کے خون پی جاتے۔ مگر انگریزوں کے ساتھ کچھ انگریزی والوں کا بھی کچھ ایسا رُعب جم گیا ہے۔ کہ بیچارے لہو کا گھونٹ پی کے خاموش ہو رہے۔ علاوہ بریں اس واقعے نے دل پر ایسا اثر کیا۔ کہ اس وقت وہ اپنے ہوش میں کب تھے۔ اُن کا خیال تو انڈین ندلینڈ ریلوے زینوں سے ٹکراتا پھرتا تھا۔ بابو صاحب کی باتوں کا جواب دیتا۔ کون بھر لقدیر اُس وقت خانصاحب پر وہی مثل صادق آتی تھی۔ کہ دبی بلی چوہوں سے کان کٹاتی ہے۔

آخر بہت ہی سست ہاتھوں اور مرے ہوئے دل سے تار ہاتھ میں لیا۔ اور گھبرائے ہوئے گھر آئے۔ اندر قدم رکھنا تھا۔ کہ بڑی بہن نے آ کہا بھائی تمہاری بھاوج کو اب ذری ہوش آیا ہے۔ ان گذشتہ دو دنوں کے اندر سارے خاندان کی مصیبت اکیلے اُنہیں کے سر آ رہی تھی۔ اور بیچارے نے دوڑ دھوپ بھی ایسی کی تھی۔ کہ پست ہو گئے۔ مگر ہمت نہ ہارتے تھے۔ لیکن اب اس حماقت اور تازہ مصیبت نے بالکل افسردہ خاطر کر دیا تھا۔ تاہم کسی طرح اطمینان نہ ہوتا تھا۔ تار نے ایک شک البتہ دل میں پیدا کر دیا تھا۔ مگر اس وقت تک کسی طرح یقین نہ آتا۔ کیا معنی ایسی بات کے تسلیم کر لینے کو جی نہ چاہتا تھا"

اور چونکہ یہ امر خود اپنی ہی حماقت کا نتیجہ تھا۔ لہذا اس کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ راز کو کسی اور پر ظاہر کریں۔ ایک عجیب گو مگو کے عالم میں تھے۔ بہن کی زبان سے جب یہ سُنا۔ کہ بھاوج کو ہوش آیا۔ تو سیدھے اُنہیں کی طرف دوڑے گئے۔ مگر خرابی یہ تھی۔ کہ جس طرح شوکت حسین نے اپنی بہو کو نہیں دیکھا تھا۔ اُسی طرح اُن کو کبھی بھاوج کے دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ بے پوچھے گچھے فقط آنکھوں سے اس راز کا حل کرنا۔ غیر ممکن تھا۔ اور یہ دل نہ مانتا تھا۔ کہ کسی کے سامنے دریافت کریں۔ لیکن بھاوج کے پلنگ کے پاس جا کے چار آنکھیں کیں۔ تو غریب لڑکی بھی ان کو متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُنہیں ابھی تک یہی خیال تھا۔ کہ بھاوج کو یہ خبر نہ ہوگی۔ مگر اُس کی نظر سے بھی ان کے شک کو ایک درجہ اور ترقی ہو گئی۔ اور ہنوز اسی تردد میں تھے۔ کہ مصیبت زدہ لڑکی نے گرچہ بولنے کی طاقت نہ تھی مگر ناتواں آواز میں کہا مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ اس کے جواب میں قاسم علیخاں نے کہا۔ اور ہاں مجھے بھی" یہ کہ اُنہوں نے ماں اور بہن کو اس فقرے سے ٹالدیا۔ کہ رات کے معاملے کے متعلق بھابھی سے کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سب ہٹ گئے۔ تو مریضہ کی چارپائی کے پاس بیٹھ کے کہا۔ "کہو کیا پوچھتی ہو؟

مریضہ۔ اتنا کہ میں کہاں ہوں؟"

قاسم علیخاں۔ فرخ آباد میں۔ ہاشم علی خاں کے گھر میں" اتنا کہہ کے قاسم علیخاں نے لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ لڑکی یہ جواب سنتے ہی رونے لگی۔ اور کہا میں تو لکھنو جاتی تھی۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ کہ اور میرے عزیز کیا کہتے ہوں گے۔

قاسم علیخاں (تسلی دیکے) "تم گھبراؤ نہیں ابھی مجھ پر اس غلطی کا حال کھلا ہے۔ بڑا دھوکا ہوگیا۔ مگر تم پریشان نہ ہو۔ اور اگرچہ یہاں تمہارا کوئی عزیز نہیں۔ مگر مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ ابھی ابھی میرے پاس بمبئی سے تار آیا۔ اس غلطی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ تمہارے خسر کا مکان میں آغا میر کی ڈیوڑھی پر ہے۔ اب اس وقت تو خاموش ہو رہو۔ ذرا بھی طاقت

آئے۔ تو میں تمہیں لے چل کے لکھنؤ پہنچا آؤں۔ مگر خبردار دیکھو۔ کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ آنے پائے۔ ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔ اور بڑے شرم کی بات ہے۔

افسوس اس پردے کی وجہ سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی۔ غریب نازوں کی پالی بدرالنسا سسرال کے راستے سے بھٹک کے یہاں آنکلی۔ اور کن کن مصیبتوں سے دوچار ہوئی۔ دوسری طرف ہاشم علیخاں کی بہو بڑی دھوم دھام کے ساتھ بدرالنسا کی جگہ عسکری کی خوابگاہ میں جا پہنچی۔ خرابی یہ کہ دونوں کو صرف پردے کی وجہ سے اتنی تمیز نہیں۔ کہ اپنے شوہر اور غیر شخص میں کسی قسم کی تمیز کر سکیں۔ افسوس بھولی اور بے زبان لڑکیوں، اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں۔ سارا قصور سوسائٹی کا ہے۔ سوسائٹی کی ان جاہلانہ رسوم سے جو نہ ہو تھوڑا ہے۔ کیا کیا نہ ہُوا ہے۔ ابھی کیا کیا نہیں ہوگا؟ تم کو انسان بنایا۔ اسلام سے تم کو برابر کے حقوق دیئے۔ مگر جاہلانہ رسد پردہ نے تمہیں لیک بیجان جانا سے بھی بدتر کر دیا۔"

قاسم علیخاں کی زبان سے یہ جملہ سن کے" ورنہ بڑی بدنامی ہوگی۔ بدرالنساء نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا" وہ کون سی ذلت و رسوائی اُٹھ رہی۔ جس کا اب ڈر ہوگا۔ مگر میں کسی سے نہ کہوں گی۔ آپ خاطر جمع رکھئے۔ اور پھر ہاتھ جوڑ کے کہا یہ مگر اتنا کیجئے۔ کہ مجھے جس حال میں ہوں اسی حال میں لے چل کے لکھنؤ یا حیدرآباد پہنچا دیجئے۔

قاسم علیخاں۔ پہنچانے کو تو جب کہو پہنچا دوں۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ کہ تمہیں اس کا خیال کب معلوم ہُوا؟"

بدرالنساء (رو کے) مجھے کل ہی معلوم ہوگیا تھا۔

قاسم علیخاں۔ اہ ہاں کل شب کا تو کچھ حال بیان کرو۔ میں بڑی حیرت میں ہوں کہ وہ بڑھیا کون تھی؟ اور کیوں مری پڑی تھی۔

بدرالنسا۔ بس! اب اس وقت اس ذکر کو جانے دیجئے۔ خیال سے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔ اُف۔ اس وقت تک طبیعت ٹھکانے نہیں ہے۔ پھر کہہ دونگی۔

قاسم علیخاں نے بھی نامناسب سمجھ کے اصرار نہ کیا۔ اور کہا یہ خیر جانے دو۔

اس کے بعد قاسم علیخاں نے سب لوگوں کو بلایا۔ اور ماں سے کہا۔ امی جان والد ان کے یہاں رہنے کو گوارہ نہیں کرتے۔ کاظم علیخاں کا پتہ نہیں۔ اور ان طبیعت کا حال معلوم ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے۔ کہ کل سی ان کو لے کے ریل پر سوار ہو جاؤں اور بمبئی پہنچا آؤں۔ اس بیچاری نے سسرال آنے کی اچھی سزا بھگتی۔"

بدر النساء "ہاں بڑا احسان ہوگا۔ کل کے ہوتے آج ہی لے چلو" لے چلو"

قاسم علیخاں کی ماں اور بہن نے ذرا تسلی و دلدہی کرکے روکنے کی کوشش کی۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی بات تھی۔ ان کے درخواست اظہار شکر گذاری کے ساتھ ڈال دی گئی۔"

اب قاسم علیخاں پھر دروازے پر گئے۔ اور کہیں باہر جانے کو تھے۔ کہ اسی تار والے چپڑاسی نے اکٹھا دو تار ان کے ہاتھوں میں دیئے۔ ان تاروں کو بھی لے جا کے پڑھوایا۔ اور معلوم ہوا۔ کہ ایک تو لکھنؤ سے شوکت حسین نے بھیجا ہے۔ اور دوسرا حیدر آباد سے آیا ہے۔ جو اکبر علی درجہ کا بھیجا ہوا ہے۔ دونوں تار برقیوں میں لڑکی کا حال پوچھا گیا تھا۔ ان تار برقیوں کا جواب دینے کے لئے بیچارے سیدھے تار گھر اور متواتر تین "تار روانہ کئے۔ ایک لکھنؤ کو۔ جس اطلاع دی تھی۔ کہ" لڑکی خیریت سے ہے۔ کل لے کے روانہ ہوگا۔ اسٹیشن پر سواری ملے " دوسرا حیدر آباد بدر النسا کے باپ کو جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ آپ کی بیٹی کو لے کر لکھنؤ جاتا ہوں۔ آیئے تو۔ ہیں آیئے۔ تیسرا "تار بھائی کے سسرے کو بھیجا۔ اور لکھا کہ " لکھنؤ جاتا ہوں۔ اور آپ کی بیٹی کو لے کے سیدھا بمبئی آؤں گا۔ یہ تینوں تار روانہ کرکے گھر واپس آئے۔ اور دن بھر کے تھکے ماندے آتے ہی پلنگ پر پڑ گئے۔ مگر ان فکروں نے رات بھر آنکھ نہ لگنے دی۔ صبح ہوتے ہی نیند آئی۔ اور پھر دن چڑھے تک خراٹے لیتے رہے۔ مگر انہوں نے یہ بڑی عقلمندی کی کہ گھر بھر میں کسی کو اس معاملے سے واقف نہیں ہونے دیا۔ اور خدا کرے۔ یہ بات یوں ہی دب کے رہ جائے۔ مگر

اُمید نہیں۔

دوسرے دن شام کو قاسم علیخاں بدرالنساء کو لئے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔اسٹیشن ہی پر شوکت حسین قلی لیئے ہوئے ملے۔ مگر بہت ہی چپ چاپ اور نادم خوشی خوشی بہو اور قاسم علیخاں کو گھر لے گئے۔ وہاں پہنچ کے معلوم ہوا۔کہ اُن کی بھاوج جب یہاں دلھنوں کی شان سے اُتری تو اُترتے ہی سو گئی۔ صبح کے تڑکے جب عسکری کمرے نکل کے جا لیا۔تو لڑکیاں اُسے نکال کے باہر لائیں۔اور ضروری رسمیں ادا ہوئیں۔ دوپہر گذر گئی۔اور کسی کو اس غلطی کا شان و گمان بھی نہ تھا۔ایک بجے کبری بیگم نے جو شادی کی خوشی میں بہت خندہ پیشانی بشاش تھیں۔ بیٹے کو باہر سے بلوالا۔اور اس کا نام لے کے پکارا تو لڑکی کے کان کھڑے ہوئے۔کہ یہ تو نیا نام ہے۔ اسی وقت سے وہ ایک سوچ میں پڑ گئی تھوڑی دیر کے بعد کسی حیلے بہانے سے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا۔کہ یہ فرخ آباد نہیں لکھنؤ ہے۔ یہ سنتے ہی اُسے یقین آ گیا۔ کہ بدرالنسا کے بدلے وہ۔ شوکت حسین کے لکھنؤ چلی آئی۔ پھر کیا بدرالنسا کی طرح اُسے عشق تو نہیں آیا۔ مگر رونا پیٹنا شروع کیا۔بال نوچ ڈالے۔ زیور اُتار کے پھینک دیا۔اور سارے گھر میں ایک قیامت بپا ہو گئی۔ شوکت حسین نے دم دلاسا دے کے پوچھا۔تو آپ نے ساری داستان کہہ سنائی۔اور غل مچا مچا کے رونے لگی۔ کہ ہائے میں تو کہیں کی نہ رہی۔ شوکت حسین نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ دیر ایک غوطہ میں رہے۔ پھر پوچھا۔ اچھا تمہیں اپنے دیور یا سسرے کا کچھ پتہ بھی معلوم ہے۔ کہ تار بھیج کے دریافت کیا جائے۔ مگر غریب لڑکی کو کیا۔ خیر۔ تب اس کے والد کا پتہ دریافت کیا گیا۔ پردے کی برکتوں سے اُمید تو اس کی بھی نہ تھی۔ مگر اُس کی خوش نصیبی سے باوا کے ساتھ دو ایک مشہور پاس پڑوسیوں کے نام اور وہ گلی جس میں مکان تھا۔یاد آ گئی مکان کا نمبر ہزار کوشش کی کسی طرح نہ معلوم ہو سکا۔ آخر اسی پتے سے تار بھیجا گیا۔ ناظم علیخاں نے فوراً تار پر فرخ آباد کا پتا بتایا۔ اور ساتھ ہی خود بھی گھبرا گئے۔ فرخ آباد کو تار دیا۔ اتنا پتہ لگنے کے بعد حیدرآباد

میں اکبر علی کو تار کے ذریعے سے اس غلطی بلکہ سانحے کی خبر کی گئی۔ اور اُن کو بھی فرخ آباد کا پتہ دیا گیا۔ جس پر انہوں نے بھی فرخ آباد کو تار دیا۔

بدر النسا کی پھوپھی نے جواب ساس کے برابر تھی۔ گلے سے لگایا۔ اور ساری سرگذشت سُنی۔ یہ سُن کے یہاں بڑی خوشی ہوئی۔ کہ بہو اتنی بڑی آفت و مصیبت میں پڑھ کے پاک دبا عفت نکل آئی۔ دوسرے دن ہی قاسم علیخاں نے بھاوج کو لے کے بمبئی کی راہ لی۔ وہ بیچاری اپنے باپ سے جا ملی۔ اور بدر النساء ہنسی خوشی عسکری کے ساتھ رہنے لگی۔ مگر اتنی خرابی ضرور ہوئی۔ کہ ناظم علیخاں کی بیٹی بدر النسا سے زیادہ حسین و خوبرو تھی۔ عسکری کو ایک حسین عورت کا ہاتھ سے آکر نکل جانے کا نہایت ملال ہُوا۔ اور بہت دنوں تک یہ خیال اُس دل سے نہ نکلتا تھا۔ مگر سعادت مند لڑکا تھا۔ اور ماں باپ کا مطیع اس کے ان خیالات سے بدر النساء کی وقعت و محبت میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔

چوتھا باب

خاتمہ

یہ واقعہ تو یہاں تمام ہو گیا۔ ابھی یہ بتانا باقی ہے۔ کہ اس اخلاق کش پردے کی اس غلطی سے جو خرابیاں ہوئیں۔ وہ کیسی سخت اور عبرتناک تھیں۔ ناظم علیخاں نے فرخ آباد تار کے ساتھ ہی ایک خط بھی لکھا تھا۔ جس میں شرمناک غلطی پر سمدھی اور اُن کے بیٹوں کو غیرت دلائی تھی۔ اُس خط کے پہنچنے سے پہلے قاسم علیخاں بدر النسا کو لے کے لکھنؤ روانہ ہو چکے تھے۔ ان کے بعد وُہ خط پہنچا۔ اور ہاشم علیخاں کے ساتھ پڑ گیا۔ اُن کو جو اس

واقعے کی خبر ہوئی۔ تو وہ دانتوں کے نیچے اونگلی دبالی۔ اور سارا حال بی بی سے کہا۔ بی بی نے بیٹوں اور بیٹیوں نے دو ایک ساتھ والیوں سے جن سے یہ خبر سارے گھرانے اور پھر سارے شہر میں پھیل گئی۔ ایک ہفتے ہی بھر کے بعد جب اس قتل کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ تو کاظم علیخاں بھی میدان صاف دیکھ کے گھر میں آ گئے۔ ان کو جب اپنی بی بی کے بدل جانے حال معلوم ہُوا۔ تو نہایت ہی برہم ہوئے۔ مگر نہیں صبر کیا۔ اور بی بی کے پھر بلانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر سُسرے نے صاف انکار کیا۔ اس لئے کہ ان کو کسی معتبر ذریعہ سے گذشتہ واقعات کی جوان کی بیٹی کے دھوکے میں بدرالنساء کو پیش آ ئے تھے۔ پوری اطلاع مل گئی۔ جس پر کاظم علیخاں اور برافروختہ ہو گئے۔ ان کی بی بی چند ہی روز بمبئی میں باپ کے پاس رہی تھی۔ کہ معلوم ہُوا حاملہ ہے۔ اس سے جو صدمہ ناظم علیخاں کے دل پر گذرا ظاہر ہے۔ کہ انہوں نے سارا واقعہ سمدھی کو لکھا۔ اور ان کے خاندان بھر کو سخت لعنت ملامت کی تھیر فرخ آباد میں پھیلی۔ تو ہوتے ہوتے کسی نے کاظم علیخاں سے بھی کہہ دیا۔ کہ تمہاری بیوی حاملہ۔ ان کی آنکھوں میں سُنتے ہی خون اُتر آیا۔ بھلا ان میں ضبط کی طاقت کہاں تھی۔ پہلے تو غصے میں جا کے باوا کے مُنہ پر گالیاں دیں۔ اور ایسی ندامت سر پر سوار ہوئی۔ کہ شہر چھوڑ کے کسی طرف نکل گئے۔ اُن کے غائب ہونے کے چوتھے دن ہاشم علی خاں صبح کی نماز پڑھ کے آتے تھے۔ کہ ناگہاں کسی شخص نے پاس آ کے طپنچہ کا فیر کیا۔ اور ہاشم علیخاں نے صدمے سے زمین پر گر کے جان دے دی۔ جب قاتل گرفتار ہُوا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ کوئی غیر نہیں۔ بلکہ مرحوم کے حقیقی بھائی یا سمدھی ناظم علیخاں سوداگر بمبئی ہیں۔ جنہوں نے اپنی بیٹی کی رسوائی پر از خود رفتہ ہو کے بھائی کو قتل کیا۔ اور خود بھی پھانسی پر لٹک گئے۔

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد لکھنؤ کے لوکل اخبارات کے کالموں میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ کہ شوکت حسین صاحب رئیس لکھنؤ کے جوان اور لائق بیٹے عسکری کو جبکہ وہ اسکول سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ ایک شخص نے چھریاں بھونک بھونک کے مار ڈالا۔ تینوں زخم لگے تھے۔ اور تینوں کاری تھے۔ قاتل گرفتار ہُوا

اور دریافت کرنے سے معلوم ہُوا۔ کہ اس کا نام کاظم علیخاں ہے۔ جس نے کسی خانگی عداوت پر ایسے ہونہار نوجوان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ دونوں نو عمر لڑکیاں عنفوانِ شباب ہی میں بیوہ ہوگئیں۔ جو زندگی بھر اسی رنج والم میں رہیں گی۔ ایک یعنی بیٹی والی باپ سُسرے اور شوہر کی موت پر زندگی بھر سرد آہیں بھرے گی۔ اور ہمیشہ اپنی حسرت نصیب ماں کے سینے کے داغ کو آگ دکھاتی رہے گی۔ دوسرے یعنی بدرالنساء نے قاتل کے کاری زخموں سے کم سن شوہر کو دم توڑتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کا رنڈاپے کا سوگوار نہ سفید دو۔ پٹہ ماں باپ اور پھوپھا پھوپھی کے زخمہانے جگر پر جب تک زندہ ہیں۔ ہمیشہ نمک چھڑکیا رہیگا۔ اور ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد خدا جانے کس گلی کوچوں کی خاک چھانے گی۔ اور یہ لاعلاج مصیبت ہمیشہ اہل عالم کو بتائے گی۔ کہ پردہ کیا ہے۔ اور کیسی چیز ہے۔ اور ہمیشہ اس عبرتناک مرقع کو لوگوں کے سامنے پیش کرے گا۔ اور اس حد شرع سے تجاوز کر جانے پر مسلمان ہمیشہ غریب بدرالنسا کی داستان کو پڑھیں گے۔ اور پچتائیں گے۔

ختم شد

ہر قسم کے قرآن شریف مترجم مع لپنجسورہ لئے ہر قسم اور بارعایت کتابیں منگانی ہوں

تو

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

سے منگائیں

ملنے کا پتہ

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب

کشمیری بازار لاہور